مذہبی بنیاد پرستی اور انقلابی سوشلزم

www.struggle.com.pk

فہرست

1۔مذہبی بنیاد پرستی کا ظہور

2۔سرمایہ داری کا زوال اور جدید بنیاد پرستی کا پس منظر

3۔موجودہ ریاست اور جدید مذہبی بنیاد پرستی

4۔نجات کا واحد راستہ۔۔۔انقلابی سوشلزم

مذہبی بنیاد پرستی کا ظہور

انسانی سماج کی تاریخ ذرائع پیداوار کی ترقی کی تاریخ ہے۔جوں جوں انسانی سماج ترقی کرتا گیا اس میں پیدا ہونے والے جدید ذرائع پیداوار انسانی سوچوں کو تبدیل کرتے رہے۔لیکن یہ ترقی کبھی بھی ہموار اور یکساں نہیں رہی بلکہ اس کا کردار متضاد کیفیت کا رہا۔جہاں ذرائع پیداوار کی ترقی نے سماج کے ترقی پسند انقلابی ذہنوں کے ذریعے نئے خیالات اور نظریات کو پروان چڑھایا اور وہ مادی حالات پیدا کیے جن سے سماج مزید ترقی کر سکے وہاں ان خیالات اور نظریات کی کمی نہیں رہی جنہوں نے فرسودہ نظریات کی بیڑیوں میں سماج کو جکڑنے کی سعی جاری رکھی۔لیکن انسانی سماج کا عمومی رجحان ترقی کی جانب رہا جس کے سامنے ہر عہد میں پرانے نظریات دم توڑتے رہے۔انسانی تاریخ میں مختلف مذاہب کا عروج وزوال اور ان کا انسانی سماج میں مختلف طبقات کے ہاتھوں میں ایک قوت کے طور پر موجود ہونا صرف ایک مظہر ہے جس کی حقیقت اس وقت کے سماج میں موجود ملکیت کے رشتے اور طبقاتی کشمکش تھی۔تاریخ میں جب ہمیں قدیم مذاہب پر عیسائیت غلبہ پاتے ہوئے نظر آتی ہے تو وہ درحقیقت غلام داری سماج کے خاتمے اور جاگیردارانہ سماج کے آغاز کا عہد تھا جس میں سماج بہت بڑے انقلابات کے ذریعے آگے بڑھ رہا تھا۔گو کہ اس وقت جو لوگ یہ انقلاب برپا کر رہے تھے وہ اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار اس زمانے اور وقت کی حدود وقیود میں رہ کر ہی کر سکتے تھے۔اسی طرح سے نشاطِ ثانیہ کا دور جس میں عیسائی چرچ کے مظالم اور عقلی خیالات کو ماننے والے انقلابیوں کے مابین ایک بہت بڑی جنگ نظر آتی ہے وہ اپنی حقیقت میں جاگیردارانہ سماج سے سرمایہ دارانہ سماج میں تبدیلی کا عہد تھا جس میں عظیم انقلابات نے انسانی سماج کی ترقی کے لیے نئے افق متعین کیے۔کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز اپنی شہرہ آفاق تصنیف کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھتے ہیں۔’’کیا یہ سمجھنے کے لئے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت ہے کہ آدمی کی مادی زندگی کی حالتوں، اس کے سماجی رشتوں اور اس کی سماجی زندگی میں جب کبھی تبدیلی ہوتی ہے تو اس کے ساتھ آدمی کے خیالات، تصورات اور نظریے، مختصر یہ کہ آدمی کا شعور بدل جاتا ہے؟ خیالات کی تاریخ نے اس کے سوا اور ثابت ہی کیا کیا ہے کہ جس نسبت سے مادی پیداوار کی نوعیت بدلتی ہے اسی نسبت سے ذہنی پیداوار کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ہر عہد میں فرماں روائی انہی خیالات کی رہی جو فرماں روا طبقے کے خیالات تھے۔لوگ جب ایسے خیالات کا ذکر کرتے ہیں جن سے سماج میں انقلاب آتا ہے تو وہ صرف اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ پرانے سماج کے اندر ایک نئے سماج کے عناصر پیدا کئے گئے ہیں اور پرانے حالات زندگی کے ساتھ ہر ہر قدم پر پرانے خیالات بھی مٹتے جاتے ہیں۔

قدیم دنیا جب آخری ہچکیاں لے رہی تھی اس وقت قدیم مذہبوں پر عیسائیت نے غلبہ پالیا۔اور اٹھارہویں صدی میں جب عقلی خیالات کے سامنے عیسائی خیالات نے ہتھیار رکھ دیئے اس وقت جاگیردار سماج اپنے زمانے کے انقلابی بورژوا طبقے سے زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔مذہبی آزادی اور ضمیر کی آزادی کے یہ خیالات صرف یہ ظاہر کر رہے تھے کہ علم کی دنیا میں آزاد مقابلے کا راج قائم ہو چکا ہے‘‘۔(کمیونسٹ مینی فیسٹو، مارکس اینگلز، 1848ء صفحہ 33)

سرمایہ دارانہ نظام کے آغاز کا دور عیسائی چرچ کی مذہبی بنیاد پرستی کے خلاف منطق کی برتری کا عہد تھا۔یورپ کے سرمایہ دارانہ انقلابات کی بنیادیں قرونِ وسطیٰ میں کیتھولک چرچ کی رجعتی سوچ اور محکوم عوام پر مظالم کے خلاف ابھرنے والی تحریکوں نے رکھ دی تھیں۔اس وقت کا چرچ جاگیردار اشرافیہ کے ہاتھوں میں ایک طاقتور اوزار تھا جسے وہ اپنی رعایا کا استحصال کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔مذہبی کتابوں کی تشریحات اس انداز سے کی گئیں تھیں جن میں امراء اور اشرافیہ کی زندگیاں عیش وعشرت میں گزارنے پر کوئی پابندی نہیں تھی جبکہ ان کے مزارعوں کے لیے زندگی ایک سلگتی ہوئی جہنم تھی۔مال ودولت کے ذریعے اپنے تمام گناہ اور مظالم بخشوائے جا سکتے تھے جس کا واضح مطلب تھا کہ سب سے بڑا گناہ غربت ہے۔انہی مظالم کے خلاف یورپ میں ابھرنے والی چودھویں صدی سے 17ویں صدی تک کی نشاطِ ثانیہ، 16ویں سے 17ویں صدی تک پروٹیسٹنٹ ریفارمیشن یا اصلاحِ کلیسا اور 18ویں صدی کی روشن خیالی کی تحریکوں نے مذہبی بنیاد پرستی کو رد کیا اور انسانی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔اس زمانے کے ان جدید نظریات کے حامل لوگوں پر شدید ترین جبر کیا گیا اور اس وقت کے حکمران طبقات نے ان تحریکوں کو دبانے کے لیے ہر طرح کے مظالم بھی ڈھائے لیکن حتمی نتیجہ مذہبی بنیاد پرستی کی شکست اور منطق کی فتح میں

نکلا۔اس وقت کے انقلابی نظریہ دانوں نے سچائی کی تلاش کے لیے گرجے کے پادری کی بجائے انسانی عقل کو معیار تسلیم کیا۔ریاست، قانون، اخلاقیات، سماجی رشتے، مذہب غرض ہر شے کو درست یا غلط قرار دینے کا معیار انسانی عقل کو ٹھہرایا گیا۔انہی نظریات کے حامل لوگوں نے بہتر اور بلند تر سماجی تنظیم اور ریاست کی تشکیل کے لیے بھی بحث کا آغاز کیا جس نے بعد ازاں بنیادی انسانی حقوق اور فرد کی آزادی کے لیے انقلابات برپا کیے۔انقلاب فرانس اسی سلسلے کی اہم ترین کڑی ہے جب سرمایہ دارانہ نظام فرسودہ جاگیردارانہ نظام پر غلبہ پانا شروع ہو گیا۔

عیسائی گرجے کے ساتھ ساتھ قرونِ وسطیٰ میں یورپ میں مسلمان حکمرانوں کے عروج وزوال اور اسلامی بنیاد پرستی کو بھی اس وقت کے بنیادی سماجی ڈھانچے کی تبدیلی کے مظہر کے طور پر دیکھا جائے تو حقیقت واضح ہوتی ہے گو کہ یہ مظہر پھر جدلیاتی انداز میں سماج پر اثرات مرتب کرتا ہے اور ان اثرات کے نتیجے میں آنے والی سماجی تبدیلی پھر اس مظہر کو تبدیل کر دیتی ہے۔یہ باہمی عمل یونہی آگے کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔قرونِ وسطیٰ میں جب جاگیردارانہ نظام اپنے عروج پر تھا اور غلام داری کو شکست دے رہا تھا اس وقت اسلامی تہذیب نے دمشق، بغداد اور قرطبہ سمیت کئی شہروں کو پوری دنیا میں سائنس اور ثقافت کا مرکز بنایا اور بہت سے اہم سائنسدان، ماہر فلکیات، ریاضی دان، ڈاکٹر اور فلسفی پیدا کیے۔لیکن یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کے عہد میں وہاں موجود اسلامی ریاستیں شکست وریخت کا شکار ہوتی چلی گئیں اور اسلامی بنیاد پرستی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگی۔یورپ میں سرمایہ دارانہ ریاستوں کے ابھرنے اور مضبوطی سے آگے بڑھنے کے ساتھ ہی پرانے سماجی ڈھانچوں پر قائم اسلامی ریاستیں بھی پوری دنیا سے ایک ایک کر کے ختم ہوتی گئیں۔17ویں صدی کے بعد بوڑوا انقلابات نے ریاست کو مذہب سے علیحدہ کر دیا اور مکمل طور پر جدید سیکولر ریاستیں وجود میں آئیں۔یہ عہد سرمایہ داری کے عروج کا عہد تھا۔

یورپ کے مقابلے میں برصغیر کی تاریخ مختلف ہے۔تاریخی طور پر ہندوستان جغرافیائی اور زرعی فطری کیفیات کے نسبتاً سہل ہونے کی وجہ سے مشکل جغرافیائی حالات میں رہنے والے قبائل اور آبادیوں کے لیے ایک کشش کا باعث تھا۔جس سے یہ کئی ہزار سال تک شمال اور مغرب کی جانب سے حملوں اور ہجرتوں کا محور بنا رہا۔قدیم ہندوستان کے آخری مقامی حکمران اشوکا کی 232 قبل مسیح میں وفات کے بعد برصغیر کے مختلف حصوں کو ترکوں، افغانوں، فارسیوں، عربوں، اتھاریوں (Tocharians) اور منگولوں نے فتح کیا۔یہاں کی زرخیزی نے ایک مخصوص طرز زندگی اور سماجی ڈھانچوں کو جنم دیا تھا جو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے خودکفیل اور نیم خودکفیل یونٹ تھے۔مارکس نے اس سماجی ومعاشی طرز زندگی پر جو تحقیق کی تھی اس کو اس نے ایشیائی طرز پیداوار یا ایشیائی مطلق العنانیت (DespotismAsiatic) قرار دیا تھا۔ان دیہاتوں کی نیم خودکفالت کی ایک لمبی تاریخ ہے جو ارتقا کے مختلف مراحل سے گزرتی رہی لیکن بنیادی سماجی نظام ایشیائی طرز پیداوار ہی رہا۔گو کہ بیرونی علاقوں سے آئے ہوئے حکمرانوں نے مذہب، زبان، لباس، ثقافت اور دوسرے شعبوں میں اثرات مرتب کیے لیکن ان کے آنے اور جانے سے نظام کی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی اور دیہاتی زندگی کی بنیادی پیداواری اکائی نہیں ٹوٹ سکی۔اسی وجہ سے بنیادی سماجی معاشی نظام تبدیل نہیں ہو سکا۔آریاؤں کی دراوڑوں پر کہیں زیادہ قدیم فتح کے بعد قدیم اشتراکی نظام تو ختم ہو گیا اور ایک نئے طبقاتی نظام نے جنم لیا جس میں کام اور محنت کی تقسیم کار مستقل اور نسل در نسل چلتی تھی اور اسی کی وجہ سے مختلف ذاتوں کی پہچان بھی تھی لیکن نجی ملکیت کا تصور موجود نہیں تھا اور زمین گاؤں کی اجتماعی ملکیت میں تھی۔بادشاہ کا نمائندہ صرف ٹیکس اکٹھا کرنے، جنگ کے لیے آدمی جمع کرنے جیسے کاموں پر مامور تھا۔ایشیائی طرز پیداوار اور اس میں گاؤں کی نیم خودوکفالت وخودمختاری اور باہمی علیحدگی کی کیفیت نے عمومی طور پر برصغیر کا سماجی ومعاشی ارتقا انتہائی سست روی کا شکار کر دیا اور وہ سماجی ارتقاء کے وہ مراحل عبور نہیں کر سکا جو یورپ نے غلام داری، جاگیرداری اور پھر سرمایہ داری کی شکل میں عبور کیے۔

اس ثقافتی معیار اور بکھرے ہوئے سماجی یونٹوں میں کسی اجتماعی مذہب یا عقیدے کا بھی فقدان تھا۔یہاں عمومی طور پر مظاہر فطرت سے الوہیت یا روحانیت وابستہ کرنے والا رجحان (Paganism) تھا۔جس نے سست رو ارتقا کی وجہ سے مختلف روپ اور شکلیں دھاریں۔ہندومت کی روایت کے مطابق یہاں 33 کروڑ دیوتا اور بھگوان ہوا کرتے تھے۔اس حوالے سے ہندومت یا مذہب کبھی بھی کسی ٹھوس، منظم اور اجتماعی شکل میں تاریخی حوالے سے یہاں موجود ہی نہیں رہا تھا۔ہندوستان کا پہلا وزیراعظم جواہر لال نہرو اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ہندوستان کی دریافت'' میں لکھتا ہے ''لفظ ''ہندو'' ہمارے قدیم ادب میں بھی کہیں بھی نظر نہیں آتا۔پہلی مرتبہ ''ہندو'' کا لفظ ایک 8ویں صدی عیسوی کی تحریر تانترک میں استعمال ہوا جہاں اسکے معنی عوام ہیں نہ کہ کسی مخصوص مذہب کے پیروکار ہیں۔۔۔ایک عقیدے کے طور پر ''ہندوازم'' ایک مبہم بے ہیئت کئی اطراف پر مبنی اور ہر فرد کے لیے ہر چیز ہے۔یہ شاید ممکن ہی نہیں ہے کہ اسکی کوئی واضح تعریف بتائی جا سکے یا پھر یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کوئی مذہب ہے بھی یا نہیں'' (صفحہ نمبر 74-75)۔

ہندوستان میں انگریزوں کے آنے اور ریلوے اور ٹیلی گراف کے بچھائے جانے سے پہلے ہندوستان یکجا قومی اکائی نہیں بن سکا تھا۔لیکن اس سے پیشتر کے عہد میں اسکی زرخیزی سے جنم لینے والی ثقافت وتہذیب میں جو بھی بیرونی فاتح آیا وہ جنگی بنیادوں پر بالادست ہونے کے باوجود اس ثقافت میں مفتوح ہو کر اس طرز پیداوار کے ڈھانچوں اور رشتوں میں سمو گیا۔16ویں اور 17ویں صدی کے صنعتی انقلابات کی تیز رفتار صنعتی وسماجی ترقی کی وجہ سے انگریز وہ پہلے جارح تھے جو ایک ایڈوانس ٹیکنالوجی کی بنا پر جنم لینے والے ثقافتی معیار کی وجہ سے مقامی ثقافت اور سماجی ڈھانچوں میں زائل نہیں ہو سکے تھے۔۔

سرمایہ داری کا زوال اور جدید بنیاد پرستی کا پس منظر

سرمایہ دارانہ انقلابات کی جاگیرداری پر حتمی فتح کے بعد جب سرمایہ دار طبقہ اقتدار میں آیا تو وہ آزادی اور برابری کے اپنے ہی کیے ہوئے وعدوں سے خوفزدہ ہونے لگا۔18ویں صدی کے اواخر میں 27 جولائی 1794ء کو فرانس میں جیکوبن کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور رابسپیئر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا۔اس کے ساتھ ہی انقلاب فرانس کے دوسرے انقلابی دور کا خاتمہ ہوا اور رجعت پر مبنی تیسرے دور کا

آغاز ہوا جسے تاریخ میں تھرمیڈور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ تیسرا دور 19 نومبر 1799ء کو اس وقت ختم ہوا جب نپولین بوناپارٹ نے اقتدار پر قبضہ کیا اور خود کو بادشاہ کہلوانے لگا۔

اسی طرح 17 ویں صدی میں انگلستان میں آنے والے صنعتی انقلاب کے بعد ابھرنے والے سماجی تضادات نے ثابت کر دیا کہ سرمایہ داری کبھی بھی فرد کی مکمل آزادی کو یقینی نہیں بنا سکے گی اور یہ انقلابات گو کہ ایک ترقی پسند عمل تھے لیکن سماج میں موجود طبقاتی کشمکش کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کر سکیں گے۔ سرمایہ داری نے روشن خیالی کے عہد کا انت کیا اور ایک نئے ثقافتی دور کا آغاز کیا جسے رومانیت کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس عہد میں انسانی کردار کے تاریک پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا اور ماضی کے سماج کی عظمتوں کے گن گاتے ہوئے اسی خیال پرستی میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی اس بات پر غور و فکر کرنا شروع کیا گیا کہ انسانیت تباہی کے رستے پر چل رہی ہے۔ یہ تمام سوچیں از خود سرمایہ داری کے بانجھ پن کے آغاز کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ ایسی ہی صورتحال میں ایک ایسی سوچ اور نظریات کا جنم لینا ناگزیر تھا جو سرمایہ دارانہ نظام کے ناقابل حل تضادات کا جائزہ لیتے ہوئے انسانی سماج کی ترقی کا رستہ متعین کرے۔ انہی حالات میں ہمیں کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز سائنسی سوشلزم کے نظریات کو تشکیل دیتے نظر آتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر اور بالاتر نظریات کے لیے ضروری تھا کہ وہ 18 ویں صدی کی روشن خیالی سے بھی آگے نکلتے ہوئے انسانی سماج کی حرکت اور اس کے بنیادی قوانین کو دریافت کریں اور ایک ایسے سماج کو تخلیق کریں جہاں ظلم، استحصال اور نابرابری کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مارکس اور اینگلز لکھتے ہیں،

(کمیونزم پر تنقید کرتے ہوئے) ''کہا جائے گا کہ "بلاشبہ تاریخی نشوونما کے دوران مذہبی، اخلاقی، فلسفیانہ، سیاسی اور قانونی سیاست اور قانونی خیالات میں ترمیم ہوتی رہی ہے۔ لیکن مذہب، فلسفہ، عمل، سیاست اور قانون ان تبدیلیوں کے باوجود ہمیشہ قائم رہے۔ پھر ان کے علاوہ کچھ ابدی صداقتیں بھی ہیں جیسے آزادی، انصاف وغیرہ، اور یہ سماج کی تمام منزلوں میں مشترک ہیں۔ لیکن کمیونزم تمام ابدی صداقتوں کی منکر ہے۔ وہ سرے سے مذہب اور اخلاق کو مٹا دیتی ہے۔ یہ نہیں کہ انہیں کسی نئی بنیاد پر مرتب کرتی ہو۔ اور اس لئے کمیونزم تمام پچھلے تاریخی تجربے کے خلاف قدم اٹھا رہی ہے۔"

اس الزام کے معنی کیا ہیں؟ تمام پچھلے سماج کی تاریخ، طبقاتی اختلافات کی نشوونما کی تاریخ ہے۔ ان اختلافات نے مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کیں۔ لیکن ان کی صورت کچھ بھی رہی ہو ایک خصوصیت تمام پچھلی صدیوں میں مشترک رہی اور وہ ہے سماج کے ایک حصے کے ہاتھوں دوسرے کا استحصال۔ چنانچہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ پچھلی صدیوں کا سماجی شعور اپنی رنگارنگی اور گوناگونی کے باوجود بعض مشترک حالتوں میں شعور کی صورتوں میں ارتقا کرتا رہا ہے اور یہ اس وقت تک پوری طرح نہیں مٹ سکتیں جب تک کہ خود طبقاتی اختلافات بالکل دور نہ ہو جائیں۔ کمیونسٹ انقلاب ملکیت کے روایتی تعلقات پر سب سے کاری ضرب ہے۔ چنانچہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اس کی نشوونما کی لپیٹ میں آ کر روایتی خیالات کی جڑیں بھی کٹ جاتی ہیں''۔ (کمیونسٹ مینی فیسٹو، مارکس اینگلز، 1848ء، صفحہ 34)

اپنے زوال کے عہد میں سرمایہ دار طبقے نے وہی ظالمانہ کردار اپنایا جو ماضی کے حکمران طبقے اپناتے رہے تھے۔ جہاں ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں ریاست اور دوسرے تمام اداروں کو محنت کش طبقے کا استحصال کرنے اور ان کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا وہاں پر مذہبی بنیاد پرستی کو بھی محنت کش طبقے کی جڑت کو توڑنے کے لیے مسلسل استعمال کیا گیا اور ابھی تک کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ خطوں میں سرمایہ داری نے اپنے منافعوں کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے سامراجی کردار اپنایا اور اپنے زیر تسلط علاقوں میں ہر ہتھکنڈے کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

برصغیر میں انگریز سامراج نے قدیم روم سے مستعار لی گئی اپنی ''تقسیم اور حکمرانی'' کی پالیسی کے لیے مذہبی تفریق کو نہ صرف از سر نو تشکیل دیا بلکہ ان میں منافرتیں پیدا کر کے اپنے نظام کو بچانے کے لیے طبقاتی یکجہتی اور جدوجہد میں دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ آج کے عہد میں سامراج نے پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے جاری کیا ہوا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں کے دور میں 1872ء میں جو مردم شماری ہوئی اس میں مذہب کا خانہ پہلی بار رکھا گیا۔ پھر 1885ء میں ڈگلس ہیوم نے کانگریس کی ایک سرکاری یونین کے طور پر باگ دوڑ ڈالی تھی۔ اسی طرح مسلم لیگ کو بنانے میں بھی برطانوی سامراج کا اہم کردار تھا۔ 1905ء میں بنگال کی تقسیم لارڈ کرزن نے مذہبی بنیادوں پر کروائی تھی اور 1906ء میں مسلم لیگ کا ڈھاکہ ہی میں تاسیسی اجلاس ہوا تھا۔ لیکن بنگال کی تقسیم کے خلاف اس وقت اتنی بڑی مزاحمت ہوئی کہ 1911ء میں اس تقسیم کو ختم کرنا پڑا تھا۔ لیکن اس سامراجی پالیسی کا سب سے بڑا واضح اظہار برطانیہ کے دائیں بازو کے رجعتی سیاست دان ونسٹن چرچل نے 1940ء کے ایک بیان میں کیا تھا کہ ''ہندو مسلم باہمی تناؤ اور تضادات ہندوستان میں برطانوی حاکمیت کا سب سے بڑا پشتہ یا بند ہیں''۔ اسی سامراجی حاکمیت کے دور میں ہندو بنیاد پرستی کو ایک نئے ''مذہب'' اور نئی رجعتی' سیاسی بنیادوں پر استوار کیا گیا تھا۔ 1923ء میں ''ہندو مہاسبھا'' کا اجلاس ہوا تھا جس میں ''کانگریس'' کے اہم لیڈر بھی موجود تھے۔ لیکن 1933ء میں انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور انگریز سامراج کے ساتھ معاہدے کی پیش کش بھی کی تھی جس میں انہوں نے ''ہندو مت'' کو اقتدار میں ایک بالادست ''قوم'' کے طور پر تسلیم کروانے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ کنونشن اجمیر میں 1933ء میں منعقد ہوا تھا۔ کا بانی بنیادی طور پر ہیڈگیواڑ تھا۔ اس کا مقصد ہندو فرقہ واریت کو مسلح غنڈہ دستے فراہم کرنا تھا۔ اس دستاویز میں یہ درج تھا کہ ''RSS (راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ) ہندو مفادات کا کسی پارٹی تفریق کے بغیر دفاع کرے گی''۔ RSS کا اہم ترین لیڈر وی ڈی سورکر (V.D.Savarkar) تھا جس نے 1937ء سے 1942ء کے دور میں اس بنیاد پرست تنظیم کی سربراہی کی تھی۔ سورکر نے ہندو مت کی جدید تعریف ایجاد کی تھی ''ہندو کا مطلب وہ فرد ہے جو دریائے سندھ سے سمندروں تک پھیلی ہوئی ''بھارت ورشا'' کی اس سرزمین کو مادر وطن اور مقدس سمجھے جو اسکے مذہب کی جنم بھومی ہے''۔ اس کے بعد بننے والی ہندو مذہبی جنونی تنظیمیں بنیادی طور پر RSS کی مختلف شاخیں' گروہ اور فرقے ہیں۔ ان میں 1950ء کی دہائی میں ایس پی مکرجی کی بنائی ہوئی ''جن سنگھ'' جس کے لیڈر اٹل بہاری واجپائی نے بعد میں بی جے پی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ بجرنگ دل' وشوا ہندو پریشت (VHP) شیوسینا اور دوسری ہندو شاونزم پر مبنی تنظیمیں اسی بنیاد کے تسلسل کی ٹوٹ پھوٹ اور گروہ بندی کی پیداوار ہیں۔ لیکن برصغیر کی تمام سیاست اور سامراج کے خلاف تحریکِ آزادی میں مذہب کو ایک کلیدی کردار حاصل کروانے میں موہن داس گاندھی کا کردار سب سے اہم اور معنی خیز ہے۔ موتی لال نہرو کی سربراہی میں کانگریس پچھلی صدی کے پہلے 20 سال مذہبی رجحانات سے کافی حد تک مبرا رہی۔ لیکن یہ گاندھی کا ابھار تھا جس نے مذہبی شاونسٹوں کو اعتماد اور تقویت دی۔ گو ظاہری طور پر گاندھی تمام عقائد اور مذاہب کا خیر مقدم کرتا تھا لیکن اس نے

روحانی احساسات اور مذہبی رجحانات کو سیاست کا محور اور مقصد بنا کر انتہا پسندانہ اور تقسیم کر دینے والے احساسات کو ابھار دیا تھا۔ چاہے وہ تمام مذاہب کی عزت اور باہمی بھائی چارے کی بات ہی کرتا تھا لیکن اس سے تمام بنیادی اور اہم انسانی مسائل اور ضروریات کے حصول کی جدوجہد جو تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے مشترک تھی وہ پیچھے دھکیل دی گئی اور مذاہب کے درمیان تناؤ اور ہم آہنگی' دوستی اور نفرت' سب کا مشترکہ خدا اور ایسے مذہبی نان ایشوز سیاست اور تحریک پر مسلط کر دیئے گئے جن سے تحریک اور طبقاتی کشمکش کو ایک گہرا گھاؤ لگانے کی کوشش کی گئی۔ سٹالنزم کی ماسکو میں زوال پذیری کے بعد کمیونسٹ پارٹی مارکسی بین الاقوامیت کو فراموش کر کے جس قوم پرستی میں دھنس گئی تھی اس سے وہ گاندھی کی مذہبی سیاست کے متبادل کے طور پر انقلابی سوشلزم کی سیاست برصغیر کے محنت کشوں اور نوجوانوں کے سامنے آشکار نہیں کر سکی تھی۔ نہرو اپنے آپ کو سوشلسٹ اور سیکولر کہلوانے کے باوجود جس نظریاتی ابہام کا شکار تھا اس کو اپنی سیاست قائم رکھنے کے لیے گاندھی کے آگے کئی مرتبہ جھکنا پڑا۔ نہرو سمجھ رہا تھا کہ وہ گاندھی کو استعمال کر رہا تھا جبکہ درحقیقت نہرو کو گاندھی بڑی چالاکی سے استعمال کر رہا تھا۔ ٹراٹسکی نے 1930ء کی دہائی میں گاندھی کو ''جھوٹے پیغمبر'' (ProphetFalse) کا خطاب دیا تھا۔

اسی طرح انگریز حکمرانوں نے مسلم لیگ سمیت بہت سی اسلامی جماعتوں اور گروہوں کو بھی ہندوستان کے محنت کش طبقے کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لیے تخلیق کیا اور بھرپور طریقے سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مسلم لیگ کا قائد جناح تھا۔ اس کا طرز بود و باش، رہن سہن، لباس اور مزاج برطانوی تھا اور انگریزوں سے ملتا تھا اور جو کسی طور بھی برصغیر کے مسلمانوں سے مشابہہ نہیں تھا جن کی نمائندگی کا وہ دعویدار تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی انگریزوں کے ساتھ اپنا ناطہ نہیں توڑا تھا۔ اپریل 1947ء میں اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ اپنی بات چیت میں کہا: ''مجھے ابھی اس کی کوئی فکر نہیں کہ آپ مجھے کتنا کم دیتے ہو، جب تک کہ آپ مجھے پورے کا پورا (پاکستان) نہیں دے دیتے۔ میں آپ کو کوئی بھی نامعقول مشورہ نہیں دینا چاہتا لیکن آپ کو یہ خیال رکھنا ہوگا کہ نیا پاکستان برطانوی سلطنت سے اس کا زیرنگین رہنے کا خواہشمند رہے گا''۔

تقسیم کے حوالے سے جناح کے جوش و جذبے کا یہ عالم تھا کہ اس نے اگست 1946ء میں کہا: ''یا تو ہندوستان تقسیم ہوگا یا یہ تباہ ہوگا''۔ یہاں ہمیں جناح ایک واضح یوٹرن لیتا نظر آتا ہے، یہی جناح تھا جس نے 1933ء میں ایک ''غیر مسلم'' والڈروف ہوٹل لندن میں کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم رحمت علی کی طرف سے دی گئی دعوت میں پاکستان نام کے ملک کی تجویز پر طنزیہ قہقہہ لگایا تھا بعد ازاں اس نے برطانوی پارلیمنٹ کی جوائنٹ سلیکشن کمیٹی میں بات کرتے ہوئے ایک الگ ملک کے تصور کو ایک بچگانہ خیال اور ناقابل عمل قرار دیا تھا۔

80 کی دہائی میں کرسٹینا لیمب نے اپنی مشہور کتاب ''اللہ کا انتظار'' میں کہا ''اگر جناح زندہ ہوتا تو پاکستان کے سخت گیر اسلامی قوانین کے تحت سزا پا چکا ہوتا، وہ ایک ایسا سرد مزاج قوم پرست تھا جو مذہب اور سیاست کو بہرصورت ایک دوسرے سے منسلک یا نتھی کرنے کے خلاف تھا اور جو 1930ء کی دہائی کے وسط سے ہی اس بات کو فخر سے بیان کرتا رہا کہ وہ پہلے ہندوستانی ہے اور بعد میں مسلمان۔ جناح نے بعد ازاں ملاؤں کے نعروں کو خود اپنے مستقبل سمیت مسلمان کاروباریوں اور زمیندار اشرافیہ کے محفوظ مستقبل کا رستہ سمجھ لیا''۔ کانگریس سے جناح کی علیحدگی کی بنیاد مذہبی نہیں تھی بلکہ طریق کار کے اختلافات تھے۔ مذہب کی بنیاد پر جدائی ایک دہائی بعد کا معاملہ ہے۔ نوآبادیاتی ریاست اس کیلئے ہوشیاری سے دھیرے دھیرے حالات اور رستے ہموار کر رہی تھی۔ لندن میں جب ہندوستان میں جاری مزاحمتوں کے اثرات سنجیدگی سے محسوس کئے جانے لگے تو یہ سوال ابھرا کہ وہاں کوئی مقامی حکومت کی قسم کا منصوبہ عمل میں لانا ضروری ہوگیا ہے تاکہ وہاں سماجی بے چینی اور بغاوت کے رستے محدود اور مسدود کئے جاسکیں۔ 1932ء میں سر تھیوڈور موریسن جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کا سابق پرنسپل رہ چکا تھا، نے مذہب کی بنیاد پر علیحدگی کے حق میں ایک متاثر کن مضمون لکھا۔ اس مضمون میں اس نے ایک صوفیانہ خاکہ پیش کیا جو آگے چل کر مسلمانوں کے ایک الگ قوم کے تصور کی بنیاد بنا۔ ''ہندو اور مسلمان ویسی ہی دو مختلف قومیں ہیں جیسی کہ دو مختلف یورپی قومیں۔ مسلمان قوم کسی طور بھی ایک بیگانی حکومت کے تحت زندگی نہیں گزار سکتی۔ خاص طور پر ایک ایسی نام نہاد جمہوری حکومت کے تحت جو اپنے شہریوں کے ساتھ امتیاز برتتی ہو۔ مسلمانوں کو اس بات کی ضمانت دی جانی چاہئے کہ وہ اپنی تہذیبی صفات و خصوصیات کے تحفظ کیلئے خود کو تنہا نہ سمجھیں''۔ (سر جان کمنگ، پولیٹیکل انڈیا، (آکسفورڈ)، 1932ء)

مسلمانوں کیلئے الگ طریق انتخاب کا اصول قبول کیا جاچکا تھا جس سے ہندوستان میں کمیونل سیاست کو پروان چڑھانے کا عمل شروع ہوتا گیا۔ لیکن ایک الگ مسلم ملک کے طور پر پاکستان کا معاملہ، مسلم لیگ اور مسلم عوام دونوں کیلئے 1944/46ء کے عرصے میں زیادہ توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ آج وہ مورخ یا مفکر جو یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا تصور اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ مسلمان ایک الگ قوم تھے، وہ محض تاریخ کو دہرانے کا مظاہرہ کر رہے ہیں، ان سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمان کب ایک الگ قوم کے طور پر سامنے آئے تو ان مذہبی مورخین و مفکرین سے اس سوال کا کوئی متفقہ و مصدقہ جواب ملنا محال ہے۔

شیعہ سنی تفریق کو ایک طرف رکھتے ہوئے، مسلمانوں میں کئی ایسے رجحان تھے جو خود کو ریفارمر یا پھر حقیقی مذہب کا صحیح اور سچا علمبردار و پیروکار گردانتے تھے۔ اور یہ سب رجحان ایک دوسرے کی حقانیت کو چیلنج کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ حقہ بند علماء باقاعدہ طور پر انگریزوں کے تنخواہ دار بھی تھے اور برطانیہ کے حکم پر فتوے اور احکامات بھی صادر کیا کرتے تھے۔ کئی علماء نے کانگریس کا ساتھ دیتے ہوئے ایک متحدہ و مخلوط نیشنلزم کے تصور کی حمایت کی۔ کچھ علماء البتہ مسلم امہ کی عالمگیر حکومت کے لئے نعرہ زن تھے' یہاں تک کہ وہ ایک ملک میں اسلام کے تصور کے ہی سخت مخالف تھے۔ یہ تصور ابوالاعلیٰ مودودی کا تھا جس نے 1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی تاکہ سیکولر نیشنلزم کے علمبردار اپنے حریفوں، دیوبند گروپ اور مسلم لیگ کے مقاصد کا کھلے عام مقابلہ کر سکے۔ مودودی نے جناح پر الزام عائد کیا کہ وہ ''اسلام کی بجائے مسلمانوں کے 'دنیاوی' سماجی و معاشی مفادات کے'' زیر اثر سب کچھ کر رہا تھا۔ اس نے برملا اعلان کیا کہ ''جناح سے لے کر معمولی عہدے کا حامل مسلم لیگ کا کوئی بھی ایک لیڈر اسلامی ذہنیت یا اسلامی شعار سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی سماجی و معاشی مسائل کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھنے کا اہل اور حامل ہے۔ ان کا گھناؤنا کردار بس اتنا ہے کہ کسی نہ کسی حیلے بہانے یا ساز باز سے

ہندوستانی مسلمانوں کے مادی مفادات کا تحفظ کر سکیں'' (پی۔ ہارڈی، برطانوی ہندوستان کے مسلمان (انگریزی)، (کیمبرج)، 1972ء)

ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت شروع ہوا جب 1917ء میں روس میں بالشویک انقلاب کا تاریخ ساز واقعہ رونما ہوا۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کے کئی سرگرم کارکن اور راہنما روس میں ہونے والے اس انقلاب سے انتہائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کی جدوجہد کا آغاز کیا جو تمام مذاہب سے بالاتر ہندوستان کے محنت کش طبقے کی سامراجی اور مقامی سرمایہ دار طبقے کے خلاف جدوجہد تھی۔ ابتدائی کامیابیوں کے بعد کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا ایک اہم عنصر کے طور پر ابھر رہی تھی لیکن سوویت روس کی سٹالنسٹ زوال پذیری کے بعد باقی دنیا کی طرح ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی بھی غلط نظریات اور لائحہ عمل کا شکار ہوگئی جس کے باعث برطانوی سامراج کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ہندوستان کا مذہبی بنیادوں پر بٹوارہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن اس سے پہلے محنت کش طبقے کی تحریکوں نے کئی دفعہ ثابت کیا کہ مذہبی تعصّبات اور منافرتیں ان سامراجی طاقتوں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کی جانب سے پیدا کی جاتی ہیں اور وہ طبقاتی بنیادوں پر ان کے خلاف لڑنے کا عزم رکھتے ہیں۔ فروری 1946ء میں جہازیوں کی بغاوت اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس بغاوت کے دوران 19 فروری کی شام کو ایک ہڑتالی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا؛ سگنل مین ایم ایس خان اور پیٹی افسر ٹیلی گراف آپریٹر مدن سنگھ کو اس کا اتفاق رائے سے صدر اور نائب صدر چنا گیا۔ ایک سکھ دوسرا مسلمان اور دونوں کی عمریں 25 سال سے کم تھیں۔ یہ ایک شعوری فیصلہ تھا جس کا مقصد قومی آزادی کی تحریک میں مذہبی تعصب کو پھیلانے کی کوششوں کو مسترد کرنا تھا۔ جو تحریک کے بورژوا لیڈر اپنے برطانوی آقاؤں کے اشارے پر کرتے جا رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کی غلط پالیسی سمیت کانگریس اور مسلم لیگ کی اس تحریک سے غداری کے باعث اس بغاوت کو کچل دیا گیا۔ اس بغاوت کے بعد برطانوی سامراجیوں نے طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کا بٹوارہ نا گزیر ہے۔ 63 سال قبل لگایہ زخم آج تک رس رہا ہے اور اس خطے میں مذہبی بنیاد پرستی کا وجود قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

اسی دوران اسرائیل اس کرہ ارض پر حالیہ تاریخ میں چوتھی مذہبی یعنی تھیوکریٹک ریاست کے طور پر معرض وجود میں آیا تھا۔ ان میں ویٹی کن سٹی (عیسائی) پاکستان (مسلمان) اور نیپال (ہندو) ایسے ممالک ہیں جن کی ریاست سرکاری طور پر مذہب کی بنیاد پر معرض وجود میں آئی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد خصوصاً برطانوی اور فرانسیسی سامراج نے مشرق وسطیٰ کی جونئی بندر بانٹ کی تھی اس میں اسرائیلی ریاست کا خاکہ پہلی مرتبہ پیش کیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد اس تیل سے مالا مال خطے پر اپنا سامراجی تسلط قائم رکھنے کیلئے یہاں مسلسل عدم استحکام کو جاری کرنا تھا تا کہ یہاں کی باہمی چپقلشوں اور تضادات میں سامراجی حاکمیت اور غلبہ قائم رکھا جا سکے۔ المیہ یہ ہے کہ 1948ء میں جب اسرائیل کی تشکیل کی قرارداد پیش کی گئی تو اس کا پیش کرنے والا ملک سوویت یونین تھا۔ اس وقت سوویت یونین پوری طرح زوال پذیر ہو چکا تھا اور اس پر سٹالنسٹ آمریت تمام سوچ اور پالیسیاں طبقاتی مفادات کی بجائے قومی اور افسر شاہانہ مفادات کے مطابق استوار کر رہی تھی۔

ہٹلر نے اپنی فسطائیت کی درندگی سے جو مظالم خصوصاً یورپی یہودیوں پر ڈھائے تھے اور ہولوکاسٹ (CastHolou) کے ذریعے 60 لاکھ سے زائد یہودیوں کا انتہائی بے دردی سے قتل عام کیا تھا اس سے یورپی عوام میں خصوصی طور پر اور دنیا بھر میں عمومی طور پر یہودیوں کے لئے ایک احساس ہمدردی پایا جاتا تھا۔ سامراجی حکمرانوں نے اس احساس کی آڑ میں جو ریاست بنانے کی واردات شروع کی تھی اس کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ 1939ء میں لیون ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ اسرائیل یہودیوں کیلئے دنیا کا سب سے بڑا اذیت ناک قید خانہ ثابت ہوگا اور اس نے اسرائیل کی تشکیل کی شدید مخالفت کی تھی کیونکہ اس کو اندازہ تھا کہ طبقاتی جدوجہد کی جڑت اور یکجہتی میں دراڑیں ڈالنے کیلئے اسرائیل کتنا بڑا سامراجی ہتھیار ثابت ہوگا۔ لیکن تمام ظاہری پراپیگنڈے کے برعکس اسرائیل کو جنم دینے والی پارٹیوں اور تحریکوں میں بہت سے ایسے عناصر موجود تھے جو خود فسطائی رجحانات سے متاثر تھے۔ مثلاً زیویا بوٹنسکی (JabotinskyZeev) کی ہیرورت (Herut) پارٹی جو 1940ء کی دہائی میں کافی سرگرم تھی اس نے بھی بہت سی سیاسی اور تنظیمی اقدار فسطائیت سے حاصل کی تھیں۔ ایسی اور بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ان پارٹیوں کی باقیات آج مختلف ناموں اور شکلوں سے اسرائیلی پارلیمنٹ کنیسٹ (Knesset) میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ عظیم سائنس دان البرٹ آئن سٹائن (EinsteinElbert) جو خود یہودی تھا اس نے 1948ء میں نیویارک ٹائمز کو لکھے گئے ایک خط میں اسرائیل کی فریڈم پارٹی (Freedom Party) کی تشکیل کی شدید مذمت کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ یہ ''نازی اور دوسری فاشسٹ پارٹیوں سے بہت مماثلت رکھتی ہے''۔ دوسری جانب اسرائیل کے قیام کی وجہ ہی الہامی اور مابعد الطبیعاتی اور انجیل کی پراسرار تصوراتی داستانوں پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسی سرزمین پر بنی اسرائیل کے رہنے کی مفروضی کہانی پر مبنی ہے جس کا انجیل اور تورات میں ذکر ہے۔ یہ سب انتہائی غیر سائنسی اور تخیلاتی دلائل پر مبنی ہے۔ لیکن سامراجی حکمرانوں نے اس کو جدید سرمایہ دارانہ منافع خوری اور مشرق وسطیٰ سے خصوصاً تیل کی لوٹ مار کیلئے استعمال کیا ہے۔ سامراج کی اس واردات سے اس کو ایک لمبے عرصے کے لئے علاقے میں عدم استحکام رکھنے اور پھیلانے کا مقصد حاصل کیا جاتا رہا ہے۔ اسرائیل اور اسکے عرب ہمسایوں کے درمیان چار بڑی جنگیں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بیشتر جنگیں اسرائیلی فوج نسبتاً آسانی سے اور کم عرصے میں جیت گئی۔ ہر جنگ کے بعد اس نے مزید عرب علاقوں پر قبضہ کیا۔ آج اسرائیلی ریاست کے پاس اس سے کہیں زیادہ رقبہ ہے جب اسرائیل کی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ 50 اور 60 کی دہائی میں پوری دنیا میں محنت کش طبقے کی انقلابی تحریکیں ابھریں اور انہوں نے اپنے اندر موجود تمام نفرتیں اور تعصّبات ختم کرتے ہوئے طبقاتی جڑت کو عملی جامہ پہنایا۔ ایران میں مصدق، مصر میں جمال عبدالناصر، انڈونیشیا میں سوئیکارنو اور پاکستان میں بھٹو سمیت پوری دنیا میں پاپولسٹ قیادتیں ابھریں جنہوں نے انقلابی سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ سامراج ان تحریکوں کو روکنے کیلئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ جہاں اس نے اسرائیلی ریاست کو اس مقصد کیلئے استعمال کیا وہاں اس نے ان سماجوں کو اندر سے توڑنے اور تحریکوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے جس مفروضے اور رجعتیت کو استعمال کیا وہ اسلامی بنیاد پرستی تھی۔ جدید اسلامی بنیاد پرستی درحقیقت امریکہ کے صدر آئزن ہاور کے وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کی ذہنی تخلیق تھی۔ سی آئی اے نے سب سے پہلے کرنل ناصر کی بڑھتی ہوئی نیشنلائزیشن اور تیزی سے بائیں جانب بڑھتے ہوئے مصر میں اس رجحان کو روکنے کے لئے اخوان المسلمین کو بے پناہ مالی اور نظریاتی کمک پہنچا کر اس سوشلزم کی جدوجہد کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا دیا۔ اسی طرح اسلامی بنیاد پرستی کو مصر کے بعد شام اور دوسرے ممالک میں ردانقلابی رجعتی قوتوں کے طور پر ابھار کر ان حکومتوں اور معاشروں میں عدم استحکام اور خلفشار پیدا کرنے کیلئے استعمال کیا گیا۔ انڈونیشیا میں جنرل سہارتو نے امریکی سی آئی اے کی آشیر باد اور نہد؟ العلماء□ اور محمدیہ جیسی اسلامی بنیاد پرست تنظیموں کی معاونت سے عوامی لیڈر سوئیکارنو کا تختہ الٹ دیا اور جدید انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قتل عام کیا۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ لوگ قتل کیے گئے

جبکہ پندرہ لاکھ نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

پاکستان میں بھی جماعت اسلامی کو پروان چڑھانے اور اس کو بے پناہ ڈالر دے کر اس کو 60 اور 70 میں ابھرنے والی انقلابی تحریک اور بائیں بازو کے بڑھتے ہوئے رجحان کو درندگی کے ذریعے کچلنے کیلئے سی آئی اے نے ہی استوار کیا تھا۔ پاکستان میں پیپلز پارٹی نے جب روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا اور سوشلزم کا پروگرام دیا تو محنت کش طبقے کی اکثریت نے اس پارٹی میں شامل ہو کر سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ لیکن جماعت اسلامی سمیت تمام مذہبی جماعتوں نے سی آئی اے کے اشاروں پر اس کی مخالفت شروع کر دی اور اس پارٹی پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دیئے۔ مصر، انڈونیشیا اور دوسرے ممالک کی طرح کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظاموں کے درمیان جنگ کو اسلام اور کفر کی جنگ بنا کر پیش کیا گیا تا کہ سماج کے پسماندہ شعور کے حامل افراد کو اپنے ساتھ جوڑ کر محنت کشوں کی انقلابی تحریک کو کچلا جا سکے۔ 1970ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی کے سوشلزم کے نعرے کو شکست دینے کے لیے دنیا بھر سے علمائے دین کے فتوے منگوائے گئے اور اعلان کیا گیا کہ جو پیپلز پارٹی کو ووٹ دے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لیکن انتخابات کے نتائج نے واضح کر دیا کہ محنت کشوں نے سوشلزم کو ووٹ دیا اور مذہب کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کو بدترین شکست ہوئی۔

جب سامراجی طاقتیں مذہبی تعصب کے ذریعے سوشلزم کے طوفان کو روکنے میں ناکام ہو گئیں تو سازشوں کے ذریعے اور پیپلز پارٹی اور بائیں بازو کی دوسری لیڈر شپ کی کوتاہیوں کے باعث قومی بنیادوں پر تحریک کو ابھارا گیا اور یہاں کے محنت کشوں کو ایک دفعہ پھر تقسیم کر دیا گیا۔ اس جنگ میں بھی جماعت اسلامی کے الشمس اور البدر ونگز نے پاکستانی ریاست کی فوج کے مشرقی پاکستان میں جاری مظالم میں بھرپور ساتھ دیا اور محنت کشوں کے قتل عام اور معصوم عورتوں کے زناء □ بالجبر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پاکستانی فوج کی طرف سے کیے جانے والے بنگالیوں کے اس بے رحمانہ اور بہیمانہ قتل عام کو اسلامی بنیاد پرستوں کی طرف سے ملنے والی مدد نے اور بھی وحشی بنا دیا۔ جنونیوں کے یہ لشکر بدقماش عناصر سے ترتیب دیئے گئے تھے جن کو ریاست پاکستان کی طرف سے بھاری تعداد میں اسلحہ اور سرمایہ فراہم کیا گیا، حقیقتاً یہ سب سی آئی اے (CIA) کی معاونت سے کیا جا رہا تھا۔ ان جنونیوں کی زیادتیاں اور بدمعاشیاں پاکستان کی فوج سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ سب کچھ کافی حد تک ایک فوجی نظم و ضبط کی ماتحتی میں ہو رہا تھا مگر بنگالیوں کا قتل عام کرتے ہوئے کسی کم سے کم معیار کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ جماعت اسلامی کی مشرقی بنگال کے ''آپریشن بلٹز'' (BlitzOperation) میں گہری مداخلت کو جنرل ریٹائرڈ قریشی نے اپنی کتاب میں بے نقاب کیا ہے جو دیناج پور/سید پور (مشرقی بنگال کے اضلاع) کا بٹالین کمانڈر رہا تھا۔ اس نے صاف لکھا ہے کہ کیسے امیر جماعت اسلامی کو وہاں کے ضلعی کمیٹ ٹروپس فارمیشن سنٹرز تک باآسانی رسائی حاصل ہوتی تھی جہاں وہ اسلامی جنونی جانبازوں کی حوصلہ افزائی اور پیش قدمی کیلئے وقتاً فوقتاً جاتا تھا، ان جہادی گروپوں کے ڈھانچے اور کاروائیوں کے طریق کار نازی جرمنی کے ''شاک ٹروپرز'' اور زار روس کے ''بلیک ہنڈرڈز'' سے مماثلت رکھتے تھے۔

اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے پاکستان میں بڑے پیمانے پر اصلاحات کیں لیکن بالشویک پارٹی کی قیادت کے فقدان کے باعث اس انقلاب کو مکمل نہ کیا جا سکا اور محنت کش طبقے کی تحریک اپنی روایتی قیادت کی نامکمل پالیسیوں کے باعث سماج کی سوشلسٹ تبدیلی میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نازک وقت پر سامراجی طاقتیں اسلامی بنیاد پرستوں سے مل کر محنت کشوں سے انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ 5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق کی شکل میں اسلام کے نام پر پاکستان میں ایک خونی آمریت مسلط کر دی گئی۔

موجودہ ریاست اور جدید مذہبی بنیاد پرستی

پاکستان اور ہندوستان جیسے ممالک میں سرمایہ داری کئی صدیاں تاخیر سے آئی اور پھر کسی انقلاب کے ذریعے نہیں بلکہ سامراجی طاقتوں کے پھیلاؤ اور ان کی نئی منڈیوں کی تلاش کے نتیجے میں۔ اسی باعث یہ کبھی بھی یہاں ترقی پسندانہ کردار نہیں ادا کر سکی اور نہ کبھی کر سکے گی۔ یہ اپنے آغاز سے لے کر آج تک سامراجی ممالک کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ انقلابات میں اہم ترین نقطہ ریاست کی مذہب سے علیحدگی تھا۔ ان انقلابات میں سرمایہ داری نے مذہب کے مقابلے میں روشن خیالی اور منطقی سوچ کی حمایت کی تھی۔ لیکن اپنے زوال کے عہد میں سرمایہ دار خود مذہب کو اپنی لوٹ مار کے لیے استعمال کر رہے تھے اور ابھی تک کر رہے ہیں۔ برصغیر کے مذہبی بنیادوں پر ہونے والے بٹوارے کے نتیجے میں وجود میں آنے والی ریاستیں کبھی بھی مذہب کو اپنے آپ سے علیحدہ نہیں کر سکیں۔ پاکستان کے سرمایہ داروں کو علیحدہ منڈی تو مل گئی جہاں انہیں دوسرے ممالک کے سرمایہ داروں کی اجناس سے مقابلہ نہیں کرنا تھا لیکن ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ذرائع پیداوار کو ترقی دے کر انہیں اس جدید تکنیک تک لے جاتے جہاں یورپ کا سرمایہ دار پہنچ چکا تھا۔ اس لیے اس منڈی میں بھی وہ صرف سامراج کے کمیشن ایجنٹ ہی بن سکے۔ پاکستان میں ایوب خان کے دور میں ہونے والی تیز ترین صنعتکاری بھی سامراجی دولت اور قرضوں کی مرہون منت تھی۔ آغاز سے ہی یہاں کے سرمایہ دار کے کردار کا جو تعین ہوا وہ انتہائی خصی اور سامراجی گماشتگی کا تھا۔ سرمایہ دار طبقے کی نااہلی کے باعث بہت جلد یہاں ریاست پر فوج نے اپنا کنٹرول سنبھال لیا۔ فوج نے سماج پر آمرانہ تسلط کے ذریعے ایسے اقدامات کرنے کی نحیف کاوشیں کیں جن سے ریاست کو بظاہر مذہب سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ایوب خان کے 1962ء کے آئین کے تحت اسلام کو ریاستی مذہب کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ 60 کی دہائی میں اس اقدام کی گنجائش پیدا ہونے کی ایک مادی وجہ اس دور میں ہونے والی تیز ترین صنعتی ترقی تھی۔ لیکن یہ صنعتی ترقی سماجی ترقی کا باعث نہ بن سکی اور محنت کشوں نے اس ریاست اور اس نظام کے خلاف انقلاب برپا کر دیا۔ وہ عہد پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انقلابی طوفانوں کا عہد تھا۔ اسی دوران دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سرمایہ داری کا پہلا معاشی بحران آیا جس نے مغربی دنیا کے سامراجی ممالک کو محنت کشوں کے خلاف زیادہ گھناؤنے ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور کیا۔

پیپلز پارٹی کی قیادت کی کوتاہیوں کے باعث جہاں پاکستان میں سوشلسٹ انقلاب ادھورا رہ گیا وہاں مزدور تحریک کے دباؤ کی وجہ سے سرمایہ دار طبقہ بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بیمار اور نحیف ہو گیا۔ اقتدار ایک

مرتبہ پھر سامراجی پشت پناہی سے فوج کے پاس چلا گیا۔لیکن اس دفعہ اسلامی بنیاد پرست پہلی مرتبہ سامراجی آشیر باد سے براہ راست ریاست پر قابض ہو گئے۔

اس کے بعد اس بنیاد پرستی کا زہر ریاست کی شریانوں میں پھیلنے لگا۔سامراج کی معاونت کے ذریعے فوج سمیت ہر ریاستی ادارے میں اس زہر کو پھیلایا گیا تا کہ اس کئی گنا زیادہ زہریلی ریاست کو محنت کشوں سے انتقام لینے کے لیے استعمال کیا جائے۔ضیاء نے فوج کے عمومی روایتی فلسفے کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مذہبی رجحانات وتعلیمات کو اس کی روزمرہ سرگرمیوں کا مرکز ومحور بنا دیا۔1976ء میں چیف آف آرمی سٹاف کا حلف اٹھانے کے فوری بعد ہی اس نے جناح کے مرتب کردہ فوج کے نعرے ''ایمان' اتحاد اور تنظیم'' کو بھی بدلتے ہوئے اسے ''ایمان' تقویٰ' جہاد فی سبیل اللہ'' کر دیا تھا۔''رجمنٹوں کے مذہبی اساتذہ کے سٹیٹس میں اضافے کرنے کے علاوہ ضیا نے تبلیغی جماعت کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں تبلیغ کی اجازت دے دی۔1984ء تک تبلیغی جماعت والے باقاعدگی سے جمعہ کی نماز کا خطبہ دینے پی ایم اے (PMA) کاکول پہنچ جاتے تھے۔بعد ازاں اس کے نئے کمانڈنٹ میجر جنرل آصف نواز نے تبلیغیوں کے اکیڈمی داخلے پر پابندی عائد کر دی اور کہا کہ یہ ملٹری اکیڈمی ہے کوئی مدرسہ نہیں۔میں بھی اس وقت اکیڈمی میں موجود تھا جب یہ سب ہوا''۔(شجاع نواز، کراسڈ سورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 385)

ریاست کے ایک اور اہم ستون عدلیہ میں بھی مذہبی بنیاد پرستی کی جڑوں کو گہرا کیا گیا۔ضیاء آمریت نے قرون وسطیٰ کے اسلامی قوانین مسلط کر کے انہیں اپنے جبر واستبداد کے لیے استعمال کیا اور انہیں سماج میں یوں نافذ کیا کہ ان کی وجہ سے عام انسانوں کی نجی زندگیوں سے وابستہ معاملات تہہ وبالا کر دیئے گئے۔80000 انسانوں کو سرعام کوڑے مارے گئے تا کہ عام لوگ خوف اور دہشت کا شکار ہو جائیں۔ عورتوں کے خلاف ظالمانہ امتیازی قوانین مسلط اور رائج کر دیئے گئے۔ان میں بدنام زمانہ حدود آرڈیننس بھی شامل تھا۔جس کے ذریعے متاثرہ عورت کو اپنے ساتھ زنا بالجبر کرنے والوں کو شناخت کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ان قوانین کی روشنی میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں ''آدھا گواہ'' بنا دیا گیا۔یہاں تک کہ عورتوں کو سنگسار کر دیئے جانے کا قانون بھی اسی آمریت نے نافذ کیا۔اس کے علاوہ فیڈرل شریعت کورٹ قائم کی گئی جبکہ توہین رسالت کے قانون میں ترمیم کر کے ملاؤں کو اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کرنے یا کافر قرار دینے کی چھوٹ دے دی گئی۔1927ء میں برطانوی سامراج نے اس قانون کو آئین کی شق 295 کے تحت اپنے مذموم مقاصد کے لیے یہاں لاگو کیا تھا لیکن 1986ء تک کے 59 سالوں میں اس قانون کے تحت صرف ایک کیس رجسٹرڈ ہوا تھا جبکہ اس قانون میں ترمیم کے بعد کے 25 سالوں میں صرف 295 سی کے تحت 1200 سے زائد کیس رجسٹرڈ کیے جا چکے ہیں۔ان کیسوں میں سے 80 لوگوں کو عدالتیں باعزت بری کر چکی ہیں لیکن ان پر جھوٹا الزام لگانے والوں کے خلاف آج تک کوئی کاروائی نہیں کی جا سکی۔

ضیاء کو یہ خیال بھی سوجھا کہ ایک ریفرنڈم کرا لیا جائے اور یوں اپنی حکومت کو قانونی بہروپ فراہم کر کے اقتدار کو طول دیا جا سکے۔''ضیا کے اس خیال پر خود اس کی اپنی فوج کے ساتھی کمانڈروں نے اعتراض کیے۔ فارمیشن کمانڈروں کی ایک میٹنگ میں اسے کئی کمانڈروں نے بتایا کہ کئی افسروں کو عوامی حلقوں میں وردی میں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔کیونکہ عوام فوجی آمریت اور اس کی طرف سے مسلط کردہ سخت اسلامی قوانین سے نالاں وبیزار ہو چکے ہیں۔ایسے افسران میں سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر شامل ہیں جو مارشل لا کی طرف سے سرعام دی جانے والی سزاؤں پر عملدرآمد کراتے ہیں' جن میں عوام کے سامنے کوڑے مارنا بھی شامل ہے۔''(شجاع نواز، کراسڈ سورڈز، (آکسفورڈ)، صفحہ 379) یکم دسمبر 1984ء کو ضیاء نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب میں اپنے ریفرنڈم منصوبے کا اعلان کیا اور بتایا کہ ''ہاں'' میں ووٹ کا مطلب یہ ہوگا کہ لوگ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اگلے پانچ سال کیلئے ملک کا صدر رہے گا۔لیکن ریفرنڈم میں جو سوال عوام کے سامنے لایا گیا وہ یہ نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا۔19 دسمبر کو پاکستان کے لوگوں کے سامنے مہارت مگر محتاط طریقے سے تیار کردہ ایک سوال پیش کیا گیا جس کا جواب ملنے پر مطلوبہ امیدوار کی کامیابی یقینی ہو جانی تھی۔سوال یوں تھا ''کیا آپ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی جانب سے کیے گئے اقدامات کی تائید کرتے ہیں جن کے ذریعے اس نے ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالتے ہوئے انہیں قرآن وسنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے؟''(ایضاً صفحہ نمبر 281) اس ریفرنڈم کیلئے ٹرن آؤٹ سرکاری اعداد وشمار کی کرشمہ سازی تھی۔مگر اس کے نتیجے میں ضیا ایک ایسا سویلین صدر منتخب ہو گیا جس نے اپنی فوجی وردی بھی نہیں اتاری۔

اپنی آمریت کیلئے درکار حکمرانی کے تقاضے پورے کرنے کیلئے ضیا نے اپنے ہم خیال اور قابل بھروسہ افسروں کو ''ضروری'' عہدوں پر براجمان کر دیا۔اگر کسی نے اس ہم خیالی سے گریز کیا تو اسے نکال دیا گیا۔اپنے ہم خیال افسروں کو اس نے تحائف اور مراعات سے نوازنا شروع کر دیا اور یوں کروڑپتی جرنیلوں کی ایک کھیپ پیدا کر دی جو ملک پر ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک حکمرانی کرتے رہے۔''ضیاء نے اسلام کو اپنے مذموم مقاصد کیلئے بری طرح استعمال کیا۔ملکی دولت سے ٹیکسوں کی مد میں حاصل ہونے والی آمدنی کو زکوٰۃ کے نام پر، سیاسی مقاصد کیلئے بروئے کار لایا گیا۔ان سبھی اقدامات کے ذریعے ملاؤں اور مذہبی جماعتوں کو خوش کیا گیا اور انہیں نوازا گیا۔خاص طور پر جماعت اسلامی پر خصوصی کرم فرمائی کی گئی''۔(ایشین سروے، جلد 28 نمبر 10، اکتوبر 1988ء)

ضیاء نے اپنے ماتحت مارشل لا ایڈمنسٹریٹروں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ اپنے اپنے متعلقہ علاقوں کے اندر ناظمین منتخب کرائیں جو لوگوں میں زکوٰۃ تقسیم کریں گے اور انہیں پنج وقتہ نمازیں بھی پڑھائیں گے۔ اسی طرح فلم، ٹی وی اور ریڈیو میں فرسودہ نظریات کو مسلط کر کے یہاں کی ثقافت کو مجروح کیا گیا جبکہ نصاب تعلیم میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں کر کے سائنس سمیت تمام مضامین میں مذہبی بنیاد پرست نظریات کو تقویت دی گئی۔لیکن اسلامی بنیاد پرست نظریات کی اس دور میں سب سے اہم مداخلت معیشت میں تھی۔اسی دوران امریکی سامراج کو افغانستان میں ہونے والے ثور (سوشلسٹ) انقلاب کو کچلنے کے لیے اپنے روایتی معاون اسلامی بنیاد پرستوں کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے بعد اس بنیاد پرست ریاست کی معاشی ودفاعی امداد میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا۔فوج کی ہائی کمان اور انٹیلی جنس ایجنسیوں خاص طور پر آئی ایس آئی (ISI) کی افغان جنگ میں سرگرم مداخلت نے انہیں امریکی سی آئی اے (CIA) کی طرف سے ملنے والی غیر ملکی امداد کے ساتھ نجی اور سرکاری سطح پر سعودی عرب سے ملنے والی رقوم کے ساتھ براہ راست اور بلاشرکت غیرے منسلک کر دیا۔''افغان جہاد کو فروغ دینے کی غرض سے اسلحہ اور سرمایہ ایک وبا کی طرح آیا جس نے انتہائی تباہ کن اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔اس کی وجہ سے پاکستان میں

منشیات کا استعمال انتہاؤں کو پہنچ گیا۔ منشیات کی سمگلنگ ایک بہت بڑی تجارتی سرگرمی بن گئی۔ یہاں تک کہ فوج بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکی اور اس کے نیشنل لاجسٹک سیل NLC کی گاڑیاں جب کراچی پورٹ سے اسلحہ لے کر شمال میں افغان سرحد کی طرف روانہ ہوتیں تو بعض اوقات کچھ بدعنوان افسر وہاں سے ہیروئن بھی ساتھ لے آتے جسے بندرگاہ اور ائیر پورٹ تک پہنچا دیا جاتا تھا''۔ (لارنس لف شلٹز، 'بش، پاکستان اور منشیات: ہیروئین کی سلطنت'، دی نیشن، 14 نومبر 1988ء)

افغانستان کے اندر روس کے ساتھ جنگ میں شدت آتے ہی مغرب، مشرق وسطی یہاں تک کہ چین سے اسلحے کی فراہمی شروع کر دی گئی جس سے ملک میں ایک نیا کلاشنکوف کلچر پیدا ہو گیا۔ اور خود آئی ایس آئی (ISI) اسلحے کی اس تجارت کے ناجائز استعمال کے ذریعے بڑی رقم بنانے کے مکروہ عمل کی روحِ رواں بنی رہی۔ مالیاتی اور سپلائی نیٹ ورک جب ایک بار قائم ہو گیا تو پاکستانی فوج کی بجائے آئی ایس آئی (ISI) نے اصولی طور پر افغان جنگ میں مداخلت کے امور سنبھال لیے۔ اس دوران سی آئی اے (CIA) اور آئی ایس آئی (ISI) کے مابین براہ راست تعاون اور خاص طور پر ڈائریکٹر سی آئی اے (CIA) ولیم کیسی اور آئی ایس آئی (ISI) کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمان کے درمیان تعلق بھی استوار ہو گیا۔ سی آئی اے (CIA) نے اس دوران اپنے پسندیدہ کمانڈروں کی خدمات بھی حاصل کیں، اس میں عبدالحق شامل تھا جبکہ سعودیوں نے بھی ایسا کیا۔ اس کیلئے معاونت سعودی خیراتی اداروں سے لی گئی جن میں سے کئی ایک اداروں کو نوجوان اسامہ بن لادن چلا رہا تھا۔ سی آئی اے (CIA) نے خود بھی براہ راست عطیات دیئے خواہ رشوت کی شکل میں یا دوسرے طریقوں سے۔ برطانیہ اور فرانس بھی رشوت اور عطیات کے اس کھیل میں شریک ہوتے رہے اور تاجک کمانڈر احمد شاہ مسعود کی آشیر باد حاصل کرنے میں لگے رہے جو پشاور میں موجود ربانی کی ہدایات پر عمل کرتا تھا۔

جنوری 1981ء میں صدر ریگن کے چارج سنبھالتے ہی امریکہ نے پاکستان کیلئے امداد متعین کر دی۔ اگلے پانچ سالوں کیلئے 3.2 ارب ڈالرز مختص کر دیئے گئے۔ ''ضیاء کی اچانک ہی کیفیت بدل گئی' اس کا لہجہ ہی بدل گیا۔ وہ ہوائی گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور کئی معاملات میں احکامات جاری کر رہا تھا۔ وہ جمہوریت کی بحالی جیسے الفاظ بھی ادا کرنے لگا'' (لکس، امریکہ اور پاکستان، صفحہ 257)۔ سی آئی اے (CIA) کی معرفت در پردہ مالی مدد جاری و ساری رہی۔ طالبان پر ایک کتاب میں منشیات کی تجارت میں پاکستانی فوج کی مداخلت کی تفصیلات بیان کی گئیں ہیں۔ ''آئی ایس آئی اور سی آئی اے کی چھتری کے نیچے افغان مجاہدین کے ذریعے منشیات کی تجارت بڑے پیمانے پر جاری ہے۔ 1992ء میں ایک عالمی ادارے کی اہم رپورٹ کے مطابق 80ء کی دہائی کی کرپشن میں خفیہ آپریشن اور منشیات اس طرح یکجا ہو گئے کہ انہیں پاکستان میں خطے کی سلامتی اور سٹریٹیجک جنگ سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں رہا'' (احمد رشید، طالبان، اسلام، تیل اور مشرقِ وسطیٰ میں نیا عظیم کھلواڑ، 2000ء، صفحہ نمبر 120)

80ء کی دہائی میں جو واقعات سامنے آئے وہ ایک بہت بڑے آتش فشاں کے نمونے تھے۔ 1983ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل اختر عبدالرحمان کو کوئٹہ میں آئی ایس آئی کا تمام سٹاف برطرف کرنا پڑا کیونکہ وہ منشیات اور مجاہدین کے لیے آنے والے اسلحے کی تجارت میں ملوث تھے۔ 1986ء میں میجر ظہور الدین آفریدی کو کراچی سے پشاور جاتے ہوئے 220 کلوگرام ہیروئین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں ہیروئین کی پکڑی جانے والی سب سے بڑی مقدار تھی۔ دو ماہ بعد ائیر فورس کے افسر فلائٹ لیفٹیننٹ خلیل الرحمان کو 220 کلوگرام ہیروئین کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے معصومیت کے ساتھ اعتراف کیا کہ یہ اس کا پانچواں چکر تھا۔ ان دو گرفتاریوں میں پکڑی جانے والی منشیات کی مالیت امریکہ میں ساٹھ کروڑ ڈالر تھی جو اس سال امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی کل امداد کے برابر تھی۔ دونوں افسران کو کراچی کی جیل میں رکھا گیا جہاں سے وہ نامعلوم طریقے سے فرار ہو گئے۔ لارنس لف شلٹز نے لکھا کہ ''آفریدی-رحمان کیس فوج اور آئی ایس آئی کے افغانستان میں ہیروئین کے نیٹ ورک سے تعلق کو آشکار کرتا ہے''۔ اس کالے دھن کی معیشت میں تیز ترین اضافہ ہو رہا تھا اور ضیاء آمریت کے بعد سے اب تک ہو رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف ملک کی سرکاری معیشت کی حالت میں کسی قسم کی کوئی بہتری نہیں آ رہی۔ عالمی سطح پر سرمایہ داری کی پالیسیوں میں تبدیلی کے باعث پاکستان میں بھی 1988ء میں نجکاری، ڈاؤن سائزنگ اور لبرلائزیشن کا عمل شروع کیا گیا لیکن ان نسخوں سے ملکی معیشت بدتر ہوتی چلی گئی اور ملک قرضوں کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ یہاں ان دو متوازی معیشتوں کا باہمی تعلق اور اس کے نتیجے میں ریاست اور پورے سماج پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لینا انتہائی ضروری ہے۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس دوران ملک میں کالے دھن کی معیشت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ پاکستان کی معیشت کے کل حجم میں اس کالے دھن کا حصہ جو 1980ء میں 5 فیصد تھا آج 60 سے 70 فیصد بن چکا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ منشیات اور اسلحے کی تجارت سے ہونے والی آمدنی سمیت تمام کالا دھن ریاست کو مسلسل کھوکھلا کرتا چلا جا رہا ہے۔ جہاں ماضی میں یہاں ریاست نسبتاً ایک اکائی کے طور پر کام کرتی تھی وہ اکائی بکھرتی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے فوج کے اندر مختلف اداروں نے آزادانہ حرکت شروع کر دی جس کے باعث وہ دوسرے اداروں سے اور پھر اسی ریاست کے ساتھ تضاد میں آنے لگے۔ پھر جہاں پہلے صرف ریاست براہ راست سیاسی پارٹیوں اور رجحانات پر اثر انداز ہوتی تھی وہاں فوج کے مختلف اداروں نے مختلف سیاسی پارٹیوں کی پشت پناہی شروع کر دی جس میں باہمی اختلافات کا ابھرنا ناگزیر ہے۔ لیکن اس سارے عمل میں امریکی سامراج سمیت دوسری سامراجی طاقتوں کی بلواسطہ اور بلاواسطہ مداخلت بھی اہم اثرات رکھتی ہے۔

اسلامی بنیاد پرستی کے جس کھلواڑ کو کمیونزم کے ممکنہ خطرے کے خلاف سی آئی اے نے شروع کیا وہ سوویت یونین کے انہدام اور چین کے سرمایہ داری اختیار کرنے کے باوجود ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد بھی محنت کشوں کی تحریکوں کو کچلنے اور انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ISI جو اس خونی کھلواڑ میں براہ راست ملوث تھی اس کے اندر مختلف گروہوں کے اس کھیل سے معاشی مفادات وابستہ ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے افسران اور عام اہلکار ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح اس مذہبی بنیاد پرستی کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ لیکن بنیاد پرستی کو تخلیق کرنا اور اس کا آغاز کرنا ایک اور بات ہے اور اس پر مکمل کنٹرول مسلسل جاری رکھنا دوسری بات۔ اپنی ہی تخلیق کردہ معیشت ایک عرصے کے بعد خود کفیل ہو کر آزادانہ کردار ادا کرنے لگی اور جہاں اس کاروبار میں ملوث مختلف دکانداروں کے اندرونی تضادات ابھرے وہاں یہ اپنے خالقوں کے ساتھ بھی تضاد میں آنے لگی۔ جنوری 2011ء میں کرنل امام کا طالبان کے ایک گروہ کے ہاتھوں قتل اس کا واضح اظہار ہے۔ کرنل امام جس کا اصل نام سلطان امیر تارڑ تھا پاکستان فوج کا افسر تھا جس نے پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول اور امریکی ریاست شمالی کیرولینا میں فورٹ بریگ کے مقام سے فوجی تربیت حاصل کی۔ پاکستان واپسی پر امام نے سپیشل سروسز گروپ میں شمولیت اختیار کی

اور وہاں سے تربیت لینے کے بعد آئی ایس آئی کا حصہ بن گیا۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف ڈالر جہاد میں امام جہاد کے لیے جانے والوں کی ریکروٹمنٹ سے لے کر تربیت تک کی نگرانی کرتا تھا۔ اس سارے عمل میں اس کا اہم کردار تھا۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد اس وقت کے امریکی صدر جارج بش سینئر نے امام کو وائٹ ہاؤس بلا کر دیوار برلن کا ٹکڑا پیش کیا۔ چونکہ اس جنگ کو جاری رکھنے والی منشیات اور اسلحے کی معیشت سے اس کا گہرا تعلق قائم ہو چکا تھا اس لیے سوویت افغان جنگ کے خاتمے کے بعد بھی امام آزادانہ طور پر کام کرتا رہا اور طالبان کو منظم کرنے اور کابل پر ان کا قبضہ کرانے میں اہم کردار ادا کرتا رہا۔ امام نے ہرات میں پاکستان کے قونصل جنرل کی حیثیت سے بھی اس بنیاد پرستی کو تقویت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن یہی امام اپنی بنائی ہوئی تنظیموں کے ہاتھوں جنوری 2011ء میں قتل ہو گیا۔ مارچ 2010ء میں کرنل امام کو آئی ایس آئی کے ایک اور سابقہ افسر خالد خواجہ اور صحافی اسد قریشی کے ساتھ اغوا کر لیا گیا۔ اس اغوا کی ذمہ داری ایشین ٹائیگر نامی تنظیم نے قبول کی۔ خالد خواجہ کو کچھ ہی عرصے بعد قتل کر دیا گیا جبکہ اس سال جنوری میں کرنل امام کو بھی قتل کر دیا گیا۔ طالبان کی طرف سے جاری کی گئی ویڈیو کے مطابق طالبان کمانڈر حکیم اللہ محسود نے اس قتل کا حکم جاری کیا۔

یہ قتل قطعاً یہ ثابت نہیں کرتا کہ طالبان اب سی آئی اے یا آئی ایس آئی کے خلاف کام کر رہے ہیں بلکہ یہ عالمی معاشی سماجی بحران اور پاکستان کی کھوکھلی ریاست کے بکھرنے کے عمل کے آغاز کے باعث اس دھندے میں ابھرنے والے شدید تضادات کا اظہار ہیں۔ حکیم اللہ سے پہلے بیت اللہ محسود اور نیک محمد جیسے کئی طالبان کمانڈروں کو پہلے مختلف ایجنسیاں اپنے کاروباری مقاصد کے لیے ابھارتی ہیں، ان سے ایک دوسرے کے خلاف خونریزی اور قتل و غارت کرواتی ہیں اور پھر خود آپس میں سمجھوتے کر کے قتل کروا دیتی ہیں۔ حکیم اللہ کو بھی قتل کروانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بچ گیا اور اس نے اپنے ہی خالقوں کی جان لے لی۔ لیکن وہ جن طاقتوں کی پشت پناہی سے سب کچھ کر رہا ہے وہ بھی اسے زیادہ لمبے عرصے تک برداشت نہیں کر پائیں گی۔ اسی طرح افغانستان میں بھی اب امریکی سامراج کھلے عام طالبان سے مذاکرات کر رہا ہے۔ اچھے اور برے طالبان کی اصطلاح استعمال کی جا رہی ہے یعنی جو ان کے کہنے پر قتل و غارت کرتے ہیں اور جو ان سے اجازت لیے بنا ایسا کرتے ہیں۔ حال ہی میں افغانستان میں امن قائم کرنے کے لیے بنایا گیا جرگہ بھی انہی لوگوں پر مشتمل ہے جو نقصِ امن کا باعث ہیں۔ لیکن یہاں بھی تضادات اتنے شدید ہو چکے ہیں کہ ایک ہی ایجنسی کے مختلف گروہ لوٹ مار کے لیے آپس میں بھی برسرِ پیکار ہیں اور دوسروں سے بھی۔ لیکن اب اس عمل کو کبھی بھی واپس اس سطح پر نہیں لایا جا سکتا جہاں سے اسے شروع کیا گیا تھا بلکہ اس معیشت اور اس کے ساتھ وابستہ سیاسی سماجی ڈھانچوں کے تضادات میں مزید شدت آئے گی اور یہ خونریزی بڑھاتے ہوئے اپنی موت کی جانب بڑھیں گے۔ پاکستان میں ابھرنے والی محنت کش طبقے کی تحریک اس تمام خونریزی کو چیرتے ہوئے حقیقی معاشی مسائل کو سامنے لائے گی۔ عوام کی تحریک کی طوفانی موجوں کے سامنے یہ چھوٹے چھوٹے گروہ تنکوں کی طرح بکھر جائیں گے۔

افغانستان میں ڈالر جہاد سے پھیلنے والے اس کاروبار میں صرف جرنیل اور فوج کے اعلیٰ افسران ہی ارب پتی نہیں ہوئے بلکہ اس نے سماج کی بہت سی پرتوں کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا ہے اور اب یہ زہر ان کی زندگی ہے۔ اس سارے عمل میں مذہبی جماعتوں کے قائدین سمیت ان کے کارکنان نے بہت مال کمایا ہے اور ابھی تک کما رہے ہیں۔ یہ مولوی جو کبھی گاؤں کے پچھڑے ہوئے طبقات سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ ان کا تعلق کسی پیداواری سرگرمی سے نہیں تھا اس لیے ان کی خوراک، لباس اور رہائش کی ذمہ داری گاؤں والوں پر ہی ہوتی تھی گو کہ ان کا سماجی رتبہ بہت کمتر تھا۔ اگر کوئی گاؤں خوشحال ہوتا تو مولوی اپنی آمد و رفت کے لیے ایک سائیکل بھی خرید لیتا تھا۔ شہروں میں بھی اکثر مولوی مختلف دیہاتوں سے ہی درآمد کیے جاتے تھے لیکن یہاں بھی پیداواری سرگرمی سے منسلک نہ ہونے کے باعث انہیں خاطر خواہ رتبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ سرمایہ دارانہ سماج میں ان کی حیثیت لمپن پرولتاریہ کی ہے۔ لیکن اپنے زوال کے عہد میں سامراج اور مقامی حکمرانوں کی اس فرسودہ نظام کو قائم رکھنے کے لیے مذہبی بنیاد پرستی کی اشد ضرورت کے باعث ان ملاؤں کے حالات زندگی بدلنے لگے۔ ساتھ ہی منشیات اور اسلحے کی کھلی تجارت نے ان کے لیے کاروبار کے نئے مواقع پیدا کیے۔ مدرسوں میں بچوں کو تعلیم دینے اور انہیں سامراجی مفادات کے لیے جہاد کے نام پر بیچ دینے کا خاطر خواہ معاوضہ ملنے لگا۔ جس مولوی کے پاس سائیکل بمشکل ہوتی تھی وہ اب لینڈ کروزروں میں مسلح محافظوں کے ساتھ پھرنے لگا۔ اگر کسی شعبے کے چند لوگوں کے پاس بہت زیادہ دولت آ جائے تو باقی بھی حسد کرنے لگتے ہیں اور اس حسد کی آگ میں اپنے اردگرد موجود لوگوں کو کھلساتے ہوئے جلد از جلد اپنے ہم پیشہ سے زیادہ دولت مند ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس پیشے میں مال وہی زیادہ کما سکتا تھا جو زیادہ مشہور ملا ہو اور جس کی آواز زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اس کے لیے شہرت حاصل کرنا ضروری تھا اور اس کا آسان ترین رستہ مذہبی منافرت اور تعصب پھیلانا اور عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانا تھا۔ جتنا زیادہ کا لا دھن اس شعبے میں آتا گیا اتنا ہی یہ سماج میں مذہبی منافرت پھیلانے کا باعث بنتا رہا۔

ملکی سرکاری معیشت کے زوال پذیر ہونے اور ریاست کے بتدریج کمزور ہونے کے باعث اس کالے دھن کا حجم بڑھتا گیا اور آئی ایس آئی سمیت فوج کے مختلف ادارے اس کاروبار کو وسعت دیتے رہے۔ اس کے لیے مختلف فرقہ وارانہ بنیادوں پر مسلح گروہ تشکیل دیئے گئے۔ مذہبی سیاسی جماعتیں جو کبھی بھی پاکستان میں عوامی بنیادیں حاصل نہیں کر سکیں ان کو ذرائع ابلاغ اور بہت سے دوسرے حربوں سے عوام کے ذہنوں پر مسلسل مسلط رکھا گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ لشکر جھنگوی، سپاہ صحابہ، لشکر طیبہ، سپاہ محمد سمیت بہت سی چھوٹی بڑی مذہبی دہشت گرد تنظیمیں اسی کالے دھن کی معیشت کو مزید فروغ دینے اور عوام کو رجعتیت سے خوفزدہ کرنے کے لیے کھڑی کی گئیں۔ معاشی زوال کے باعث اور عالمی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کی کمزوری کے باعث جیسے جیسے ریاست روایتی طریقوں سے استحصال کرنے سے قاصر ہوتی رہی ویسے ویسے ان مذہبی گروہوں کی خونریزی اور قتل و غارت بڑھتی گئی۔

سماج میں موجود پسماندہ پرتیں بھی یہاں موجود سرمایہ دارانہ نظام کے ادھورے پن کی وجہ سے شدید کرب میں مبتلا تھیں۔ یہاں کا درمیانہ طبقہ جس میں تاجر، وکلاء، ڈاکٹر، صحافی اور دوسرے پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہیں، ان کا ایک حصہ معاشرے میں موجود بے یقینی، افراتفری، بے ہنگم پن اور عدم استحکام کے باعث ان بنیاد پرستوں کی جانب مائل ہوا اور ان کی مالی معاونت بھی کر رہا ہے لیکن اس مالی معاونت کی بنیادی وجہ بھی درمیانے طبقے کے ان افراد کی بدعنوانی، دھوکہ دہی، زمینوں پر ناجائز قبضے اور دوسرے غیر قانونی ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو سماجی اور قانونی اعتبار سے جائز بنانا ہے۔ معاشرے میں موجود کرپشن اور اسمگلنگ کا پیسہ اپنے اوپر مذہب کا لبادہ اوڑھ کر خود کو سماج میں قابل قبول بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جتنا یہ لبادہ زیادہ اوڑھتے ہیں اتنا ہی ان کی منافقت محنت کشوں پر واضح ہو جاتی ہے۔ اسی

طرح اس طبقے کا پیداواری عمل میں براہ راست حصہ نہیں ہوتا بلکہ یہ محنت کشوں کی پیدا کی ہوئی دولت پر جونکیں ہوتی ہیں جو ان کا خون پی کر زندہ رہتی ہیں۔ تاجر خود کوئی شے پیدا نہیں کرتا لیکن محنت کشوں کی پیدا کی ہوئی دولت کو منڈی تک پہنچانے کا حصہ وصول کرتا ہے۔ گاہک کے انتظار میں وہ مسلسل بے یقینی کی کیفیت میں رہتا ہے اور مقدر، قسمت جیسے الفاظ اسے دوسروں کی نسبت زیادہ متوجہ کرتے ہیں۔ مذہبی محافل اور رسومات میں پیسے خرچ کر کے وہ مرنے کے بعد کی زندگی کی آسائشیں خریدنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس دنیا کے کاروبار میں اضافے کے لیے بھی مسلسل وظیفے اور دم کرواتا رہتا ہے۔

ان طبقات کی بے یقینی اور خوف بنیاد پرستوں کے لیے کاروبار کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ پیروں، فقیروں کی درگاہیں، مولویوں کے جائز و ناجائز اخراجات اور بہت سی مذہبی دہشت گرد تنظیموں کو بھاری چندہ ان ہی افراد سے ملتا ہے۔ مذہب کے نام پر اس کاروبار میں آمدن کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف اپنے گاہکوں کو مزید خوف میں مبتلا کیا جائے بلکہ دوسرے دکانداروں کی جھولی میں گرنے سے بچانے کے لیے انہیں دوسروں کے خلاف تعصب اور نفرت میں مبتلا کیا جائے۔ پاکستان کے سماجی معاشی نظام کی بنتر ٹوٹنے کے بعد اس بے یقینی اور عدم استحکام میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے جس کے باعث اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث لوگوں کی آمدن بڑھی ہے۔ لیکن مذہبی بنیاد پرستی کے کاروبار کے حجم میں اضافے کے باعث یہ اب اس آمدن پر اکتفا نہیں کر سکتے اس لیے اغوا برائے تاوان، بینک ڈکیتی، کار چوری اور دوسرے حربوں سے آمدن بڑھا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے جہاں ریاست اور اس کے ادارے ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں وہاں مذہبی بنیاد پرستی کے کاروبار میں شامل لوگ اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے ماضی کی تمام حدیں پھلانگتے جا رہے ہیں۔ خودکش دھماکوں اور قتل و غارت کو مذہب کے نام پر استعمال کر کے وہ اپنی وحشت کو مسلط کرتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن محنت کش طبقہ کبھی بھی مذہبی بنیاد پرستوں کو سنجیدہ نہیں لیتا۔ سولہ گھنٹے تک مشقت کرنے والا انسان جس کے پاس تن ڈھانپنے کو پورے کپڑے نہیں اور سر چھپانے کے لیے کوئی مستقل آسرا نہیں اس کے پاس مذہبی رسومات کے لیے درکار وقت، پیسہ اور دوسرے وسائل ہی نہیں۔ جھونپڑیوں میں رہنے والی اور شدید گرمی میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والی خواتین پردہ کیسے کر سکتی ہیں۔ اسی طرح فیکٹریوں اور دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے محنت کش مرد اور عورتیں ان ملاؤں کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق زندگی نہیں گزار سکتے۔ ایک سروے کے مطابق آج پاکستان میں 18 فیصد لوگ ایک وقت کے کھانے کو ضرورت سمجھتے ہیں۔ ایسے میں روزے کے دوران دو وقت کا کھانا ان کے لیے بہت بڑی عیاشی ہے۔ لیکن جن ادوار میں انقلابی تحریکیں موجود نہیں ہوتی حکمران طبقات محنت کشوں کی سوچوں کو مجروح کرنے کے لیے ایسی سوچوں اور رجحانات کو خود پروان چڑھاتے ہیں۔ ایسے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ عبادت گاہوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن عبادت کرنے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں سامراجیوں، سرمایہ داروں، اور حکمران طبقات کا خصی پن بھی نظر آتا ہے۔ وہی سرمایہ دار طبقہ جس نے اپنے آغاز میں روشن خیالی کو فروغ دیا آج پوری دنیا میں نہ صرف مذہبی بنیاد پرستی کو استعمال کر رہا ہے بلکہ سنجیدگی سے اس پر یقین بھی کر رہا ہے۔ پاکستان کا حکمران طبقہ کبھی بھی سماج کو صحت مند رجحان نہیں دے سکا لیکن آج وہ خود اتنا غیر مستحکم اور نحیف ہو گیا ہے اور حالت نزع میں ہے کہ اس نے ان بنیاد پرست رجحانات کو سچ تسلیم کرنا شروع کر دیا ہے۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹیوں اور حکمران طبقات کے محلوں میں ہونے والی مذہبی تقریبات میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ صدارتی محل میں ہر روز ایک کالا بکرا ذبح کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکمران طبقات کو اپنے منافعوں کو جاری رکھنے کے لیے اس بنیاد پرستی کی معیشت پر بھی پہلے کی نسبت زیادہ انحصار کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وزیروں اور مشیروں سے لے کر بڑے بڑے بیوروکریٹ اور سرمایہ دار ان مذہبی تعصّبات کا حصہ بن چکے ہیں اور بنیاد پرستی کے فروغ میں مسلسل انفرادی اور اجتماعی کردار ادا کرتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ عرصے سے پاکستان کے حکمران طبقات کے 'لبرل' دھڑوں نے سول سوسائٹی کی اصطلاح دریافت کی ہے جو مذہبی بنیاد پرستی کی مذمت تو کرتے ہیں لیکن ان کی جڑ سرمایہ داری اور سامراجی جارحیت کے سب سے بڑے حمایتی ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں مقامی اور عالمی ذرائع ابلاغ میں اپنا مؤقف رکھنے کا بلاتعطل موقع بھی ملتا ہے اور اسی ریاست میں اہم حصہ بھی۔ یہ دانشور، صحافی، وکلاء، فنکار، این جی اوز کے مالکان، 'انسانی حقوق' کے علمبردار اور امراء کے لیے قائم نجی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مذہبی رجعتیت کو ختم تو کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے قانونی، آئینی، مذاکرات یا فوجی آپریشن اور سامراجی جارحیت کا طریقہ اپنانا چاہتے ہیں۔ ایسا طریقہ جس میں موجودہ معاشی نظام کو کوئی زد نہ پہنچے۔ لیکن جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ یہ مذہبی بنیاد پرستی اس ریاست اور معیشت کی رگ و پے میں اتر چکی ہے اور اس کا لازمی جزو بن چکی ہے اس لیے جب تک محنت کش طبقہ خود اپنی طاقت سے اس معاشی نظام کو ختم نہیں کرتا اور اس ریاست کو اکھاڑ کر نہیں پھینکتا اس زہر کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب یہ سول سوسائٹی اسی نظام میں رہتے ہوئے اس زہر کے خاتمے کی بات کرتی ہے تو اس کے ملاؤں سے تضادات ابھرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک خونی تضاد میں ہمیں پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کا قتل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو بنیاد پرستوں کی رجعتیت اور قدامت پسندی کو درست طور پر عیاں کر رہا تھا اور دلیری سے ان کا گھناؤنا کردار بے نقاب کر رہا تھا لیکن اس کے پاس محنت کش طبقے کی حمایت نہیں تھی بلکہ جس ریاست کا وہ نمائندہ تھا وہ محنت کشوں پر تاریخ کا بدترین جبر کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ریاست کے جس لبرل دھڑے کی نمائندگی کر رہا تھا وہ خود بہت سے بنیاد پرستوں کے ساتھ مل کر اس کالے دھن کی معیشت میں حصے دار ہے۔ ایسی صورتحال میں سلمان تاثیر کا قتل اسلامی بنیاد پرستوں کی طاقت کا نہیں بلکہ اس ریاست اور اس نظام کی کمزوری کا ثبوت ہے۔ اور اس نظام کی کمزوری اس کی پیدا کردہ بنیاد پرستی کی کمزوری ہے۔

سوویت یونین کے انہدام کے بعد جہاں سی آئی اے کے دانشور فوکویاما نے ''تاریخ کے خاتمے'' کا نعرہ لگایا وہاں افغانستان میں بنیاد پرستوں کی داخلی جنگ کا آغاز ہو گیا جن کی ڈوریں پھر مختلف معاشی مفادات کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اسی دوران پاکستانی آئی ایس آئی کی جانب سے طالبان کے نام سے تنظیم تعمیر کر کے پاکستان اور افغانستان میں اس رجعتیت کو بڑی بنیادوں پر منظّم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ گیارہ ستمبر 2001ء کے امریکہ پر حملوں کے بعد سامراجی طاقتوں نے اس اپنے ہی تخلیق کردہ مذہبی بنیاد پرستی کے کاروبار کو عالمی سطح پر استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا۔

خود امریکی صدر جارج بش نے صلیبی جنگوں کا نعرہ دنیا پر مسلط کیا اور سی آئی کے دانشور سیموئل ہنٹنگٹن کا ''تہذیبوں کا تصادم'' کا نظریہ حکمران طبقات کے ذریعے عوام کے شعور پر حاوی کرنے کی کوشش کی۔ اس سب کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ طبقاتی کشمکش ماضی کا حصہ ہے اور آج کی جدید دنیا میں یہ وجود نہیں رکھتی۔ اس کے علاوہ یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام ہی دنیا کا آخری اور حتمی نظام ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ تاریخ کے طالبعلم کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جب بھی کوئی حکمران طبقہ سماج میں کسی قسم کی بہتری لانے سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ اپنی حاکمیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رکھنے کی خواہش میں

رجعتی ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ وہ تبدیلی کے قانون کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے حالانکہ وہ خود ایک بہت بڑی تبدیلی کے ذریعے اقتدار میں آتا ہے۔ آج پاکستان سمیت پوری دنیا کے حکمران طبقات اسی وسوسے کا شکار ہیں۔ اپنی بکھرتی ریاستوں اور ڈوبتی معیشتوں کو بچانے کے لیے وہ ہر طرح کے حربے استعمال کر رہے ہیں جن میں مذہبی بنیاد پرستی ایک مرتبہ پھر ان کا بہترین آلہ کار ہے۔

ہندوستانی ریاست جو اپنے آپ کو سیکولر کہنے کا ناٹک کرتی ہے اس میں بھی مذہبی بنیاد پرستی بڑے پیمانے پر سرایت کر چکی ہے۔ 30 ستمبر 2010ء کو بابری مسجد کیس میں الہ باد ہائی کورٹ کا فیصلہ اس کا واضح اظہار ہے۔

بابری مسجد اور اس سے ملحقہ 27 ایکڑ زمین کی ملکیت کے لیے پہلا مقدمہ 1885ء میں دائر کیا گیا تھا جس کو برطانوی دور کی عدالت نے مسترد کر دیا تھا۔ اس کے بعد 1950ء، 1959ء، 1961ء اور 1989ء میں مختلف مقدمات دائر کیے گئے۔ 1949ء میں 60 افراد پر مشتمل ہندو انتہا پسندوں کے گروہ نے بابری مسجد میں مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کے بت سمگل کر کے رکھ دیئے تھے اور ضلعی انتظامیہ نے ایک ''خونریز تصادم'' کے خطرے کی وجہ سے ان کو ہٹوانے سے انکار کر دیا تھا۔ 40 سال بعد بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایک ملک گیر یاترا شروع کی اور ایل کے ایڈوانی کی سربراہی میں اس ہجوم نے کدالوں اور مختلف اوزاروں سے اس مسجد کو مسمار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ہونے والے مذہبی فسادات میں 2000 سے زائد افراد مارے گئے تھے۔ الہ باد ہائی کورٹ نے اب جو مصالحت اور خوفزدگی پر مبنی فیصلہ دیا ہے اسکے مطابق 460 سالہ پرانی اس مسجد کے ملبے اور ملحقہ زمین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان میں تین پارٹیوں کو یہ جائیداد تقسیم کی گئی ہے جس میں ''سنی وقف بورڈ'' ایک ہندو فرقہ ''نرموہی اکھاڑا'' اور ''ہندو مہاسبھا'' حصہ دار ہیں۔ لیکن اس فیصلے کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ ایک دیومالائی تخیل اور تصوراتی داستان کہ بھگوان رام اس مسجد کے ایک گنبد کے نیچے کی زمین پر پیدا ہوا تھا کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جس سے 1992ء میں مسجد کو گرائے جانے کے اقدام کو ایک ''قانونی'' جواز مل گیا ہے۔ دہلی کے ایک صحافی و تجزیہ نگار سمانتھ سبرامنیم کے مطابق اگر ہندو کیلنڈر اور اس کی افسانوی باطنی عقیدوں کی روایات کا گہرا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ''رام'' تقریباً 17 لاکھ سال پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس فیصلے میں حقائق کی دنیا کو فراموش کر کے عقیدوں اور توہمات کے عالم میں لایا گیا ہے۔ لیکن بھارت کے وزیر اعظم منموہن سنگھ اور دوسرے ''معتبر حلقوں'' نے اس مصالحتی فیصلے کو سراہا ہے۔ لیکن اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ہوگی اور ہندوستانی اخبارات کے مطابق مسلم گروپ اس پر تلملا رہے ہیں اور ہندو مہاسبھا پوری جائیداد کے حصول پر تلی ہوئی ہے۔ اس سے سیاسی فائدے اٹھانے کا کام شروع بھی ہو چکا ہے۔ لعل کشن ایڈوانی نے اپنی 1992ء کی یاترا کے درست ثابت ہونے کا پرچار شروع کر دیا ہے اور دوسرے لیڈر اس کو اپنے طور پر استعمال کرنے کے چکر میں ہیں۔ لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی سیکولر جمہوریت ہونے کے باوجود شاید دنیا میں سب سے زیادہ مذہبی فرقہ واریت پر مبنی منافرتوں، تنازعات، خونریزی اور قتل و غارت گری کا ملک کیوں اور کیسے بن گیا۔ بٹوارے کے بعد جو ''آزاد'' ہندوستان معرضِ وجود میں آیا اس کا حکمران طبقہ تاریخ کے میدان میں اتنی تاخیر سے داخل ہوا تھا کہ وہ سیکولر ازم سمیت سرمایہ دارانہ قومی جمہوری انقلاب کا کوئی فریضہ بھی مکمل نہیں کر سکا تھا۔ جس سے مذہبی جنونیت اور فرقہ واریت ہندوستان کی سیاست میں مسلسل خونریزیوں اور میرٹھ (1967ء) سے گجرات (2002ء)، امرتسر (1984ء) سے لے کر بمبئی (1993ء) ہندوستان کے ہر حصے میں مذہب کی بنیاد پر فسادات اور قتل و غارت کا سبب بنتی رہی ہے۔ اس کا اعتراف نہرو نے خود آزادی کے 9 ماہ میں ہی 6 مئی 1948ء کو ہندوستان کے پہلے مقامی گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ کو لکھے گئے خط میں کر لیا تھا ''ہماری سیاست تمام کردار اور اخلاقی بنیادیں کھو چکی ہے۔ ہم خالص مفاد پرستوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ مجھے کوئی شک نہیں کہ ہم تیزی سے زوال پذیر ہیں اور اپنے نقطہ نظر اور سرگرمیوں میں رجعتی ہوتے جا رہے ہیں''۔

کانگریس (جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے ہوئے نہیں تھکتی) نے بار بار مذہبی جنون اور فسادات کو اپنے اقتدار کے لیے استعمال کیا۔ ہندوستان کی ریاست اپنی نااہلی اور بحرانوں کی شدت سے بچنے کے لئے مذہبی تعصبات کو ابھار کر اصل تضادات کی سمت موڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ کانگریس نے جہاں ہندو شاونسٹوں کو رعائتیں دی ہیں وہاں مسلمان ملاں اشرافیہ کو بھی بے پناہ مراعات دی ہیں اور ہندوستان میں ''مسلم فیملی لاز'' کے ذریعے قوانین بنا کر مسلمان محنت کشوں کے بہت سے حقوق سلب کیے ہیں۔ 21 اکتوبر 2010ء کے ڈان میں اس کا دہلی کا نامہ نگار جاوید نقوی لکھتا ہے ''ایودھیا کا تنازعہ شاید ہی ہندو مسلمان مسئلہ ہو۔ زیادہ درست یہ سمجھنا ہوگا کہ اس کو ایک ایسی اختراع یا تدبیر بنایا گیا ہے تاکہ اس جعلی سیکولر ریاست کے لیے اپنے شہروں کے درمیان تناؤ کو ابھار کر ان کو عدم توازن کی کیفیت میں رکھے۔ ہندوستان کی ریاست کو مذہبی فرقہ واریت کی ایک اتحادی کے طور پر ضرورت ہے۔ اس کے برعکس قرون وسطیٰ کے عہد میں ہندوستان کی ریاستیں اپنے وقتوں سے بہت آگے تھیں۔ مغلوں سے قبل کی ریاستوں نے (بھگت) کبیر جیسے افراد پیدا کیے جو کھل کر مسلمان اور ہندو مذہبی پیشواؤں پر کڑی تنقید کرتے تھے۔ لیکن ہندوستان کی جدید ریاست نے ان مختلف عقائد سے مرغوب ہوتے ہوئے فرقوں کے پھیلاؤ کے مسئلہ کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کا ذریعہ بنا لیا ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ سے ہندو اور مسلمان شناخت زیادہ مستحکم ہوئی ہے جو تفریق شاید ایسے تنازعات کے بغیر مٹ سکتی تھی''۔ مذہبی جذبات اور نازک احساسات کا استعمال صرف ریاستیں ہی نہیں کرتیں بلکہ نجی شعبہ میں بھی اسکے کاروبار میں وسیع پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔ مذہب کی اس کمرشلائزیشن اور شہریائی جانے (Cosmopolitisation) نے اس کو سرمایہ داری کے تحفظ کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی ہے جبکہ سرمائے کے مذہبی رجحانات میں سرائیت ہونے سے اس کے کردار میں بہت اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ مذہبی عبادت گاہوں، رسوم اور مخصوص تہواروں کو بڑے بڑے کاروباروں کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ مثلاً بنارس (وناراسی) میں 1999ء میں اکانومی کلاس کی پوجا کی تمام رسوم کو پورا کرنے کے لیے 550 روپے لگتے تھے۔ افراط زر سے آج یہ رقم بھی کافی بڑھ گئی ہوگی۔ بہتے دودھ کی گلی میں ننگے پاؤں چلنے سے لے کر سونے کے مندر میں بھگوان کے درشن اور گنگا میں اشنان تک تقریباً 13 مقامات پر پرشاد لینے اور نقدی دینے کی رسمیں سرمایہ داری کے تحت اس عبادت میں لازم ہو چکی ہیں۔ لیکن دوسری جانب مذہبی تنظیموں اور گروہوں کو سرمایہ دار اپنے مختلف قبضوں اور دوسرے مالی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں چونکہ حکمران طبقات تاریخی، معاشی اور مالیاتی طور پر اس قابل نہیں کہ وہ مکمل طور پر ایک صحت مند اقتصادی نظام رائج کر سکیں اس لیے وہ اپنی چوریوں کی پردہ پوشی کے لیے ریاست کے ساتھ ساتھ مذہبی فتوؤں، پیشواؤں اور تنظیموں کو استعمال کرتے ہیں۔ اس سے نہ صرف مذہبی تنظیموں کو مالی توانائی ملتی ہے بلکہ ان کے لیڈر خود مالیاتی طور پر بالادست طبقات کا حصہ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس عمل میں مذہبی تنظیموں میں چپقلشیں بڑھتی ہیں اور اپنی طاقت بڑھانے اور دکھانے کے لیے اسلحہ اور دبدبے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سارا کھلواڑ بڑھتے بڑھتے دہشت گردی کا کاروبار بن جاتا ہے جس کو پروان چڑھانے کے لیے ایک طرف تو مسلسل طاقتور اور زیادہ سے زیادہ

وحشت ناک کرنے کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے اور دوسری جانب اسی ہوس کی کشمکش میں نئے فرقے بنتے ہیں جو باہمی تصادم، خونریزی اور دہشت گردی کو مزید بھیانک بناتے ہیں۔ سرمائے کے بنیادی کردار اور ضروریات کے بغیر یہ دہشت گردی پروان چڑھ ہی نہیں سکتی اور کالے دھن کی ضبطگی اور اسکے کردار کے مکمل خاتمے کے بغیر آگ اور خون کا یہ کھیل ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ تو خود اس سرمایہ دارانہ نظام کے بحران کی شدت اور اسکے گل سڑ جانے کی ایک علامت ہوتی ہے۔ ظاہری طور پر عام لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اس کو نظریات اور عقیدوں کا نام دیا جاتا ہے جبکہ اس کے اصل محرک لالچ اور دولت کی ہوس ہوتے ہیں۔

ایران میں بھی 1979ء میں شاہ ایران کے خلاف ابھرنے والا انقلاب وہاں کی تودے (کمیونسٹ) پارٹی کی سٹالنسٹ پالیسیوں کے باعث کامیاب نہ ہوسکا جس کے بعد وہاں بھی ریاست پر ملائیت کا غلبہ ممکن ہوا۔ پوری دنیا میں واویلا کیا گیا کہ یہاں اسلامی ریاست قائم ہوگئی ہے لیکن درحقیقت وہ ایک سرمایہ دارانہ ریاست تھی جو اینگلز کے بقول حکمران طبقات کے لیے جبر کا آلہ ہوتی ہے مگر ایران میں اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہاں سرمایہ دارانہ نظام کی وحشت کو اسلامی قوانین کے زہر میں ڈبو کر فارس کی خوبصورت تہذیب پر مسلط کر دیا گیا۔ ہر قسم کی آزادی رائے پر پابندی لگا دی گئی اور ریاستی جبر کے تمام اداروں کو مذہبی تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔ سپریم لیڈر کے عہدے کا تقدس پیغمبروں کے تقدس سے بھی زیادہ بڑھا دیا گیا اور اس کی غلط پالیسیوں، بدعنوانی اور استحصال کے خلاف بات کرنے کو بھی سنگین جرم اور گناہ کبیرہ قرار دے دیا گیا۔ خواتین پر مظالم کی انتہا کر دی گئی اور انہیں ہر وقت ماتمی لباس میں قید رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اپنے اس مذہبی بنیاد پرستی کے جبر کو تقویت دینے کے لیے ایران کے حکمرانوں نے اسرائیل اور امریکہ کے خلاف نعرے بازی کو استعمال کیا گو کہ عراق اور افغانستان پر امریکی جارحیت میں ایرانی حکمرانوں نے درپردہ امریکی سامراج کی مکمل حمایت کی۔ لیکن اپنے عوام پر خارجی دشمن کا خوف طاری کر کے استحصال کو شدید کر دیا گیا۔ منڈی کی معیشت کے اداروں کے نام اسلامی اصطلاحات کے ساتھ تبدیل کر کے اسلامی معیشت کا ڈھونگ رچایا گیا۔ لیکن 2009ء میں ابھرنے والا نوجوانوں کا انقلابی طوفان اس تمام جبر کو چیرتا ہوا ابھرا اور ریاستی عہدیداروں کے ہر قسم کے تقدس کو پامال کرتا ہوا حقیقی آزادی کی تلاش میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس انقلابی تحریک کے دوران یوم عاشور جیسی مذہبی تقریبات کے دوران لاکھوں کے مظاہرے اور احتجاج ہوئے جس میں عوام نے ریاستی جبر کے لیے مذہب کے استعمال کو سرعام بے نقاب کیا۔ اسی طرح سعودی عرب سمیت تمام خلیجی اسلامی ممالک خطے میں امریکی سامراج کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں اور عالمی سرمایہ داری کے اہم ستون ہیں۔ لیکن ان تمام ممالک میں مذہب کے نام پر استحصال شدت سے موجود ہے۔ پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش اور دوسرے غریب اسلامی ممالک سے آنے والے محنت کشوں کو ان ممالک کے حکمران حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور سخت ترین قوانین کے ذریعے ان کی محنت کو لوٹا جاتا ہے۔ ہر تارک وطن محنت کش کو یہاں کے مقامی سرمایہ دار کا غلام بن کر رہنا پڑتا ہے اور مالک اس کے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک کر سکتا ہے۔ محنت کشوں کو کسی بھی قسم کا تحفظ میسر نہیں۔ وہ انتہائی بدتر حالات میں رہ کر مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تاکہ گھر پیسے بھجوا سکیں اور اپنے اور اپنے خاندان کی زندگی کی ڈور قائم رکھ سکیں۔ لیکن اب ان ممالک کی اپنی مقامی آبادی میں بھی بیروزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے خلاف تحریکیں ابھر رہی ہیں۔ صرف سعودی عرب میں بیروزگاری کی شرح 10 فیصد ہے جبکہ 15 سے 24 سال کی عمر کے نوجوانوں میں یہ 40 فیصد ہے۔ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے جہاں وہ پہلے دوسرے ممالک میں مذہبی بنیاد پرست تنظیموں کی مالی امداد کرتے تھے اب وہ اپنے ممالک میں بھی القاعدہ اور اس جیسی دوسری تنظیموں کا ہوا کھڑا کر کے مذہبی بنیاد پرستی کے جبر کو شدید کر رہے ہیں تاکہ طبقاتی کشمکش کو فرقہ وارانہ تعصّبات مسلط کر کے روکا جاسکے۔ دوسری طرف مصر اور تیونس کے ممالک میں سیکولر اور لبرل حکمران طبقات نے بھی لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے اسلامی بنیاد پرستوں کا ہوا کھڑا کر رکھا تھا۔ سامراجی ذرائع ابلاغ یہی کہتے تھے کہ اگر ان لبرل سامراجی ایجنٹوں کو یہاں سے ہٹایا گیا تو اسلامی بنیاد پرست ریاستوں پر قابض ہو جائیں گے جبکہ ماضی میں جن ریاستوں میں بھی بنیاد پرست ریاست پر قابض ہوئے اس میں امریکی سامراج کی مکمل پشت پناہی شامل تھی۔

لیکن عرب کے حالیہ انقلابات نے واضح کر دیا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستوں کی سماج میں کوئی بنیادیں نہیں اور محنت کشوں اور نوجوانوں نے ان مٹھی بھر لوگوں کو رد کر دیا ہے۔ سامراج کے گماشتے دانشور بھی یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اخوان المسلمین کا کچھ عرصہ قبل تک ہی عالمی میڈیا بہت خوف سے نام لیتا تھا اور مختلف تبصروں اور زاویوں سے بتایا جاتا تھا کہ یہ مصر میں کتنی طاقتور ہوتی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مذہبی جنونی تنظیم کے اقتدار میں آنے کے امکان پر بھی گھنٹوں بحثیں کی جاتی تھیں اور بتایا جاتا تھا کہ ایران کی طرز کی ملائیت پر مبنی ایک اور حکومت بن سکتی ہے۔ لیکن مصر کے نوجوانوں اور محنت کشوں کی اس تحریک نے ان تمام تناظروں کو رد کر دیا ہے۔ اس انقلاب نے واضح کر دیا ہے کہ مذہبی جنونیت اور بنیاد پرستی کی سماج میں کوئی حمایت نہیں۔ اسی لیے اب اخوان المسلمین کے سی آئی اے کے ایجنٹوں سے رابطے ہو رہے ہیں جو مصر میں ایک نیشنل یونٹی گورنمنٹ بنانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ لیکن اب کوئی بھی ایسی حکومت جو سلگتے ہوئے بنیادی معاشی مسائل حل نہیں کرے گی لوگ اسے ہٹانے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ اس لیے ممکن ہے کہ آنے والے عرصے میں مختلف مخلوط حکومتیں نظر آئیں۔ ایک کی ناکامی کے بعد دوسری اور پھر تیسری۔ لیکن اس عدم استحکام کو ختم کرنے کے لیے مصر کی فوج اپنے معاشی سیاسی مقاصد کے لیے ان مخلوط حکومتوں کا سلسلہ ایک فوجی آمریت کے ذریعے بند کر سکتی ہے۔ عوام کی بے چینی اور انقلاب کی گرمائش کے باعث اسی آمر فوج میں اکیسویں صدی کا ایک اور جمال عبدالناصر پیدا ہوسکتا ہے جو فوجی آمریت کو ختم کر کے بائیں بازو کی جانب سفر کا آغاز کرے اور منڈی کی معیشت پر کاری ضربیں لگائے۔ اس سارے عرصے میں لیبیا، تیونس، ایران اور دوسرے ممالک میں ہونے والے واقعات بھی مصر کے عوام پر اثر انداز ہونگے۔ فلسطین میں بھی حماس اور دوسری بنیاد پرست تنظیموں کا کردار لوگوں پر واضح ہو چکا ہے اور وہ عرب حکمرانوں کی حمایت کی اسی پالیسی پر گامزن ہیں جس پر اسرائیل کا حکمران طبقہ بھی چل رہا ہے۔ فلسطین اور اسرائیل کے محنت کش طبقے کی سامراجی جبر اور استحصال کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی کاوشوں کا بھی آغاز ہو چکا ہے کیونکہ فلسطین سمیت مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کا حل صرف ایک رضاکارانہ سوشلسٹ فیڈریشن میں ہے جو سرمائے کی غلامی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرے۔ موجودہ انقلابی طوفان نے واضح کر دیا ہے کہ پوری دنیا میں نسلِ انسانی کے لیے آگے بڑھنے کا واحد رستہ سوشلزم ہے۔

عرب انقلاب اور اس کے حق میں عوامی مظاہروں نے ثابت کر دیا ہے کہ تہذیبوں کا تصادم صرف چند شر پسند ذہنوں کی پیداوار ہے جسے دنیا پر مسلط کیا جارہا ہے جبکہ دنیا کا محنت کش طبقہ اسے اپنے عمل سے رد کرتا ہے۔ جہاں سامراجی طاقتیں اپنے مفادات کے لیے شعوری طور پر تہذیبوں کا تصادم مختلف ملکوں اور علاقوں میں مختلف طریقوں سے کرواتی ہیں وہاں ایودھیا جیسے مقامات کی ملکیت پر تنازع اور تصادم بھی اسی

پالیسی کا حصہ ہے۔ چاہے وہ ایودھیا میں بابری مسجد ہو، فلسطین کے شہر بیت الحلم (LehemBete) میں حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش ہو، نابلوس میں حضرت یوسف کا مزار ہو، اسپین میں قرطبہ کے شہر میں مسجد اور گرجے کا جھگڑا ہو، یا پھر استنبول میں مسجد عثمانیہ اور بائزنٹائین گرجے کا تضاد ہو۔۔۔ ہر جگہ ان مقامات کو شعوری طور پر مذہبوں کے درمیان کشمکش کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ صورتحال اس حد تک بگاڑی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اہلیہ سارا کی حبرون (Hebron) (فلسطین) میں آخری آرام گاہ مشرقِ وسطیٰ میں یروشلم کے بعد سب سے متنازعہ جگہ بنا دی گئی ہے حالانکہ تمام توحیدی مذاہب (اسلام، عیسائیت اور یہودیت) حضرت ابراہیم کے معتقد ہیں۔ سامراجی ذرائع ابلاغ اور سیاست دان بنیادی ضروریات اور مسائل کی محرومی سے توجہ ہٹانے کے لیے مذہب کو مسلسل مرکزی ایشو کے طور پر ابھارنے میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے مذہبوں میں اعتدال پسندوں (Moderate) اور انتہا پسندوں کی تفریق سامنے لائی جاتی ہے۔ لیکن اس عمل میں میانہ روی رکھنے والے جلد انتہا پسند ہو جاتے ہیں اور انتہا پسند دولت کی ہوس میں مفاد پرستی میں چلے جاتے ہیں۔ پھر مختلف فرقوں کے تضادات ابھارے جاتے ہیں اور یہاں سے مختلف مذاہب کے درمیان حقارتیں اور خونریزیاں کروائی جاتی ہیں اور اسی طرح ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی وغیرہ کے پیشوا اور انکی جنونیت ایک دوسرے کے ساتھ تضادات کو ابھار کر ایک دوسرے کی شکتی اور طاقت کا باعث بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کی وحشت اور درندگی پر پلتے ہیں۔ اس سارے خونی کھلواڑ کو مالیاتی سرمایہ اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن آج پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی اور زوال واضح ہو چکا ہے۔ 2008ء کے معاشی بحران اور اب دنیا بھر میں ابھرنے والی انقلابی تحریکوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں اور حکمرانوں کے ایوانوں میں زلزلے برپا کر دیئے ہیں۔ ان انقلابی سرکشیوں کو روکنے کے لیے وہ ماضی کے غیر سائنسی نظریات کو استعمال کرنے کے نئے حربے تلاش کر رہے ہیں لیکن حتمی فتح سوشلزم کے جدید سائنسی نظریات کی ہی ہوگی۔

نجات کا واحد راستہ۔۔۔ انقلابی سوشلزم

سوشلزم ہی آج کے انسانوں کو وہ سماج دے سکتا ہے جہاں طبقاتی نظام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور انسان کا جسم اور اس کا شعور ہر قسم کی زنجیروں سے آزاد ہو۔ وہ مذاہب جو اپنے آغاز میں انسان کو آگے بڑھنے کا جذبہ دیتے رہے آج سرمایہ دارانہ زوال کے عہد میں انسان کی سماج سے بیگانگی کا اظہار بن گئے ہیں۔ لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں جب روس میں انقلاب آیا تو اس کی آبادی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس وقت کی ریاست دوسرے تمام ہتھکنڈوں کی طرح مذہبی بنیاد پرستی کو بھی محنت کشوں کی تحریک کو کچلنے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ بلیک ہنڈرڈ سمیت بہت سی مذہبی دہشت گرد تنظیمیں موجود تھیں جنہیں ریاست کی جانب سے منظّم کیا جاتا تھا اور وہ سماج پر رجعتیت مسلط کرنے کے لیے مذہب کے نام پر قتلِ عام کرتی تھیں۔

اس سلسلے میں ہمیں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ بالشویکوں کا بنیاد پرست تنظیموں اور آرتھوڈوکس چرچ کی جانب کیا رجحان تھا جس کی بنیاد صرف مارکسزم کی مادی بنیادیں نہیں تھیں بلکہ زار کے روس میں چرچ کی جانب سے ادا کیا جانے والا مخصوص کردار بھی تھا۔ روس میں چرچ سب سے بڑا جاگیردار تھا جس کی 75 لاکھ ایکڑ زمین تھی اور سالانہ آمدن 15 کروڑ روبل تھی۔ یہ زار روس کا ایک اہم ہتھیار تھا۔ جب انیسویں صدی کے اواخر میں مزدور تحریک میں ابھار آیا تو روسی پادریوں سے کہا گیا کہ وہ انقلابیوں کے ٹھکانے ڈھونڈنے میں خفیہ پولیس کی مدد کریں اور انہوں نے یہ فریضہ بخوبی سرانجام دیا۔ اس کے بعد کے عرصے میں چرچ کی جانب سے بالشویکوں کے خلاف فتوے بھی جاری ہوتے رہے اور وہ ان پر ہونے والے مظالم میں زار کی معاونت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنوری 1918ء میں آرتھوڈوکس چرچ کے سربراہ نے بالشویکوں پر فتوے لگا کر انقلاب کی مدد کرنے سے منع کر دیا۔ اس دوران بالشویک پارٹی کی تعمیر میں جہاں سیاسی اور معاشی صورتحال کی طرف درست لائحہ عمل اور طریقہ کار کی ضرورت تھی وہاں چرچ کے انقلاب دشمن رویے اور محنت کشوں کے عمومی مذہبی رجحان کو بھی متوازن انداز میں برتنا انتہائی اہم تھا۔ 1905ء میں لینن نے ''سوشلزم اور مذہب'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں اس نے واضح انداز میں اس طریقہ کار کی وضاحت کی۔ اس مضمون میں اس نے لکھا کہ، ''کسی بھی صورتحال میں ہمیں مذہب کے سوال کو تجریدی، خیال پرستی کے انداز میں یا پھر ایک ''دانشورانہ'' انداز میں نہیں دیکھنا چاہیے جس کا طبقاتی جدوجہد سے کوئی تعلق نہ ہو جیسا کہ بورژوازی سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ کرتے رہتے ہیں۔ ایسا سوچنا بیوقوفی ہوگی کہ ایک ایسا سماج جہاں محنت کش عوام پر نہ ختم ہونے والا جبر اور استحصال جاری ہو وہاں مذہبی تعصّبات کو صرف پراپیگنڈہ کے طریقہ کار سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھولنا بورژوا تنگ نظری ہوگی کہ انسانیت کی مذہب کی محکومی محض سماج میں معاشی محکومی کی پیداوار اور عکاسی ہے۔ کسی بھی تعداد میں پمفلٹ یا تبلیغ پرولتاریہ کو روشن خیال نہیں کر سکتی جب تک وہ خود سرمایہ داری کی تاریک قوتوں کے خلاف جدوجہد سے روشن خیال نہیں ہوتا۔ محکوم طبقے کا زمین کو جنت بنانے کے لیے حقیقی انقلابی جدوجہد میں اتحاد ہمارے لیے کہیں زیادہ اہم ہے ایسے فکری اتحاد سے جو پرولتاریہ کا بحیثیت مجموعی مرنے کے بعد کی جنت کے خیال پر ہو''۔ (لینن، سوشلزم اور مذہب، 1905ء)

ریاست کے مزدور تحریک کو کچلنے کے لیے مذہبی بنیاد پرستی کے استعمال اور مزدور ریاست میں چرچ کے کردار کے بارے میں اس نے لکھا، ''رجعتی بورژوازی پوری دنیا میں اور اب روس میں بھی اس بات پر توجہ دے رہی ہے کہ مذہبی فسادات کروائے جائیں تاکہ عوام کی توجہ اہم اور بنیادی معاشی اور سیاسی مسائل سے ہٹائی جا سکے جسے اب انقلابی جدوجہد میں متحد روسی پرولتاریہ حل کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ پرولتاریہ کی طاقتوں کو توڑنے کی یہ رجعتی پالیسی جو اب بلیک ہنڈرڈ کے یہودیوں کے خلاف منظّم قتلِ عام میں نظر آتی ہے کل کوئی زیادہ مکارانہ شکل اپنا لے۔ ہم ہر قیمت پر پرولتاریہ کی یکجہتی کی وکالت اور دنیا کی سائنسی توجیہہ پیش کرتے ہوئے سکون، استقلال اور صبر سے حکمرانوں کی مذہبی بنیاد پرستی کو فروغ دینے کی حکمتِ عملی کی مخالفت کریں گے۔ ایسی تبلیغ جو دوسرے درجے کے اختلافات کو ابھارنے جیسی نہیں ہوگی۔ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے تو انقلابی پرولتاریہ مذہب کو ایک نجی معاملہ بنانے میں کامیاب ہوگا۔ اور اس سیاسی نظام میں جس پر قرونِ وسطیٰ کی کائی نہیں ہوگی، پرولتاریہ معاشی غلامی کے خاتمے کی وسیع اور کھلی جدوجہد کرے گا جو انسانیت کے ساتھ مذہبی دھوکے کا اصل منبع ہے''۔ اسی مضمون میں لینن نے بالشویک پارٹی کا مذہبی سوال کی جانب طریقہ کار بھی وضع کیا، ''ہم ہمیشہ دنیا کی سائنسی توجیہہ کی تبلیغ کریں گے اور ہمارے لیے ضروری ہے کہ بہت سے ''عیسائیوں'' کی اپنی باتوں سے انحراف کرنے کی عادت کے خلاف لڑیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کے سوال کو سب سے پہلی ترجیح دے دی جائے جہاں سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں، نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ حقیقی انقلابی معاشی اور سیاسی جدوجہد کی قوتوں کو تیسرے درجے کی آراء اور بے معنی خیالات کے لیے توڑ دیا جائے۔ ایسے خیالات خود ہی اپنی سیاسی اہمیت

تیزی سے کھودیتے ہیں اور معاشی ارتقا کے رستے پر جلد کوڑے کی طرح باہر پھینک دیئے جاتے ہیں''۔ اقتدار میں آنے کے بعد بالشویک پارٹی نے مذہب کو ریاست سے علیحدہ کرنے کا اعلان کر دیا اور تعلیمی نظام کو چرچ کے اثرات سے آزاد کر دیا۔ تمام شہریوں کو مذہب کے بارے میں بحث کرنے کا حق دے دیا گیا۔ پادریوں کو عبادت گاہوں تک محدود کرتے ہوئے چرچ کی تمام جائیداد کو ضبط کر لیا گیا۔ چرچ کے پاس عبادت کرنے، تنظیم سازی کرنے، میٹنگیں بلانے اور پراپیگنڈہ کرنے کا مکمل اختیار تھا۔ لیکن پادریوں کے پاس سوویت انتخابات میں ووٹ ڈالنے یا سوویت تنظیموں میں منتخب ہونے کا اختیار نہیں تھا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ عبادات میں توجہ مرکوز کریں اور سیاست اور دوسرے انتظامی امور کو علیحدہ رہنے دیں۔ اسی طرح کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی جانب سے عیسائیت اور دوسرے مذاہب کی تاریخی مادیت کے نقطہ نظر سے وضاحت بھی پیش کی گئی اور اس مقصد کے لیے مختلف میگزین بڑی تعداد میں جاری کیے گئے۔ لینن اور ٹراٹسکی کے بعد سٹالنزم کا رویہ دوسرے معاملات کی طرح مذہب کی جانب بھی غیر سائنسی تھا۔ الٹرا لیفٹ دور میں 1929ء میں پورے سوویت یونین میں تمام گرجوں کو زبردستی بند کر دیا گیا اور پورے سوویت یونین سے پادریوں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ مذہبی مقامات کو مسمار کر کے عقیدہ پرستوں کی دل آزاری کی گئی جس سے مذہبی جنونیت کو تقویت ملی۔ لیکن بعد کے ادوار میں دائیں جانب جھکتے ہوئے تمام پادریوں کو نہ صرف جلاوطنی سے واپس بلا لیا گیا بلکہ 1936ء کے 'نئے آئین' میں پادریوں کو ووٹ ڈالنے اور سوویتوں میں منتخب ہونے کا حق دینے سمیت زار روس کے وقت کی بہت سی مراعات واپس کر دی گئیں۔ بعد کے ادوار میں بھی اسی طرح کی پالیسیاں چلتی رہیں جن میں کبھی انتہائی دائیں جانب اور کبھی انتہائی بائیں جانب موڑ مڑے گئے۔

اس کے برعکس لینن اور ٹراٹسکی کا اصول تھا کہ ان سماجی بنیادوں کو ختم کیا جائے جو مذہبی رجعتیت کے پنپنے کا باعث بنتی ہیں اور اس فرسودہ ڈھانچے کو ختم کرنے کے علاوہ سائنسی سوچ اور فکر کو بھی پروان چڑھایا جائے اور ایسی تعلیم، دانش اور فلسفے کو فروغ دیا جائے جو سماج کے ہر پہلو کا سائنسی انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے نتائج اخذ کریں۔ اس طرح مذہبی بنیاد پرستی کو جڑ سے اکھاڑا جا سکے گا۔ بوسیدہ سماجی ڈھانچہ جس میں عوام کی وسیع اکثریت کے لیے زندہ رہنے کی بنیادی ضروریات کی شدید قلت ہو مذہبی جنونیت کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حکمران طبقات اپنی عیاشی اور محنت کشوں کے استحصال اور ان پر کیے جانے والے مظالم کی وجوہات مذہب سے تلاش کرتے ہیں۔ مذہبی پیشواؤں اور مذہبی تنظیموں کو محنت کشوں کی سوچ کو مقید کرنے اور انہیں اس ظلم کو قسمت کا لکھا سمجھ کر سہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انقلابی سوشلزم کا نظریہ مذہبی عقائد پر حملہ کرنے کی بجائے اس طبقاتی نظام اور سماج میں موجود نابرابری کو سائنسی بنیادوں پر غلط ثابت کرتا ہے اور انہی سائنسی بنیادوں پر جدوجہد کا رستہ متعین کرتے ہوئے اپنی منزل طے کرتا ہے۔ اس کی منزل ایک ایسا سماج ہے جس میں طبقاتی نظام کا خاتمہ ہو جائے اور کسی بھی شخص کا استحصال نہ کیا جا سکے۔ ایسے میں کسی بھی طبقے کے لیے مذہبی نظریات کا اپنی حکمرانی کو قائم رکھنے یا دولت میں اضافے کے لیے استعمال ممکن نہیں رہے گا۔ ساتھ ہی جب سماج میں موجود پسماندگی خوشحالی میں تبدیل ہو جائے گی تو مذہبی جنونی عناصر ناپید ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مزدور ریاست کے لیے انتہائی اہم ہو گا کہ وہ سماج کی ترقی کے لیے سائنسی سوچ کو پروان چڑھائے اور ہر قسم کے نظریات پر سائنسی بنیادوں پر بحث کو فروغ دے۔ اس ماحول میں غلط اور جھوٹے نظریات خود ہی دم توڑ دیں گے اور صرف وہی نظریات زندہ رہیں گے جو انسانیت کو فلاح اور خوشحالی دے سکیں اور انسانی سماج کو آگے کی جانب لے جا سکیں۔ ایک سوشلسٹ انقلاب کے بعد مذہبی منافرت، فرقہ واریت، بنیاد پرستی اور جنونیت کو ختم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ہتھیار ہوں گے۔ اول تو سرمایہ دارانہ سماج میں موجود زائد پیداواری صلاحیت سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اشیائے ضرورت اور سماجی سہولیات کی اتنی بہتات کو یقینی بنانا تاکہ نفسا نفسی اور ذہنی ہیجان کو پروان چڑھنے کا موقع ہی نہ مل سکے جو ان سب بیماریوں کی حقیقی کوکھ ہے اور دوم لینن اور ٹراٹسکی کا وہ سائنسی اور اصولی طریقہ کار جو آج بھی اس وقت سے زیادہ قابلِ عمل ہے۔ اور پھر ہمارے پاس پچھلی ایک صدی کی سائنسی دریافت اور تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ سیاسی تجربات اور ان کے اسباق کے وہ قیمتی اوزار بھی تو موجود ہیں جن کے ذریعے ہم اس پرانے گلے سڑے اور فرسودہ معاشی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور ریاستی ڈھانچے کو نیست و نابود کریں گے اور عالمی سوشلسٹ معاشرے کی تعمیر و تشکیل کریں گے۔